مٹی کا قرض

مٹی کا قرض

(ثلاثیاں، غزلیں، نظمیں)

میں صد سخن آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں
(میر تقی میر)

حمایت علی شاعر

Himayat Ali Shair
C.B.45,Al-Falah Society
Shah Faisal Colony, Karachi-75230 Pakistan.
Ph: 92-21-4571322

تازہ ایڈیشن	2007ء
اہتمام	اوجِ کمال
کمپوزنگ	محمد شہزاد شفیق
قیمت	200 روپے

زیر اهتمام
ماہنامہ دنیائے ادب کراچی
623،6 فلور، ریگل ٹریڈ اسکوائر ریگل چوک، صدر۔ کراچی 74400
Ph: 92-21-8480816 / 0212018365
Cell: 0300-2797271 E-mail: dunyaeadab@yahoo.com

برادرِ محترم

مسلم ضیائی کے نام

پروانہ چراغِ حرم و دیر نہ داند

(عرفی)

ترتیب

میزان (پیش لفظ) حمایت علی شاعر

مٹی کا قرض ڈاکٹر سید عبداللہ

گفتنی و ناگفتنی (ایک نظم) حمایت علی شاعر

ثلاثیاں

الہام جدلیات

اسلوب تناسخ

شاعری شرط

اساس تعلق

علم خوش فہمی

حرفِ آخر دوسرا رخ

حسن تحریر المیہ

یقین بے کسی

خودفریبی دانشور

انکشاف ابن الوقت

زاویۂ نگاہ کرسی

دسترس رویت ہلال

مابعدالطبیعات ذوقِ تعمیر

ارتقاء نمائش

انتباہ تضاد

ارتفاع مساوات

زندگی کشش ثقل

ازل سے ایک عذابِ قبول و رد میں ہوں
کبھی خدا تو کبھی ناخدا کی زد میں ہوں

حمایت علی شاعر

نظمیں

تجدید
اردو اور بابائے اردو
سمندر اور انسان
ہوا
تضاد
آدمی
سنگ میل
جواب
ایک منظر۔۔۔ایک سوچ
اندیشہ
سناٹا
حسن ناصر
دھڑکا
مٹی کا قرض
لہو
مارچ پاسٹ
لمحۂ فکر

پسِ دیوارِ حرف
چاند، خورشید کا رازداں
وفاداری بہ شرطِ استواری
بادل
شاہ بھٹائی
بابائے اُردو
ماجد، میرا دوست
ٹھہرا ہوا لمحہ
تشنگی کا سفر
ان کہی
پَرتَو
تذبذب
بہروپ
خلاء
کلفٹن
متوسط طبقہ
بازگشت

غزلیں

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
پیشِ نظر تا دور سلگتا ملبہ ہے
راہ دشوار ہے، فرشِ گلِ تر ہونے تک
یہ بات تو نہیں ہے کہ میں کم سواد تھا
کل تک تو اِک فریبِ یقیں تھا، گماں کے ساتھ
دنیا سمجھ رہی تھی کہ سورج گہن میں تھا
اِس دشتِ سخن میں کوئی کیا پھول کھلائے
منزل کے خواب دیکھتے ہیں پاؤں کاٹ کے
ٹوٹا نہیں، بکھر کے بھی خواب جنوں ہنوز
آتش کدۂ دل کو ہوا کیوں نہیں دیتے
دل پر گراں گزرتا ہے اب تیرا ساتھ بھی
اُٹھنے لگا دھواں، دلِ غم انتساب سے
اہلِ نظر کو دولتِ حسنِ نظر ملی
میں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے
میں وہ یقیں ہوں، نظر آئے جو گماں کی طرح
الفاظ ہیں کہ زہر کے پیالے بھرے ہوئے
لٹا دیا ہے غمِ آب و تاب میں کیا کیا
کیسے کیسے خواب دکھلائیں مہ و اختر مجھے
اس عرضِ سخن کا مجھے یارا تو نہیں تھا
اس دشت پہ احساں نہ کرا ے ابرِ رواں اور
پندارِ زہد ہو کہ غرورِ برہمنی
یم بہ یم پھیلا ہوا ہے پیاس کا صحرا یہاں
اپنا اندازِ جنوں سب سے جدا رکھتا ہوں میں
میرا شعور مجھ کو یہ آزار دے گیا
دل میں تھا جو خیال وہ لکھا نہ جا سکا
شاعر صاحب اس بستی میں کس کو گیت سناتے ہو
رات سنسان، دشت و در خاموش
آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن جاگتے رہنا

راستہ تیرہ وتار ہے، کچھ کہو
نالۂ غم، شعلہ اثر چاہیے
رکتا ہے اُجالا کہیں ظلمت کی سپر سے
کسی طرح یہ شبِ تار، مختصر ہو تو
ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم
آئے تھے تیرے شہر میں کتنی لگن سے ہم
ہر رہنمائے وقت ہے رہزن، ترے سوا
پندارِ یوسفی سہی، پندار ہی تو ہے
جس کو دیکھ کے شاعر تم للچائے بہت
آدمی ہوں کہ دیوتا ہوں میں
اُس کے غم کو، غمِ ہستی تو مرے دل نہ بنا
ہر زخمِ دل کا لطف تھا تیغِ جفا کے ساتھ
یہ آرزو ہی رہی، کوئی آرزو کرتے
متاعِ دردِ ملی، سوزِ جاودانہ ملا
خداوندا، یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
اہتمامِ شبِ ہجراں ہوگا

ادھوری غزلیں

حمایت علی شاعر

میزان

(پیش لفظ)

وقت کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہے۔ میرا ہر عمل اُس کی نگاہ کی زد میں ہے۔ میں جو کچھ دیکھتا ہوں، جو کچھ سوچتا ہوں اور جو کچھ کہتا ہوں۔۔۔ لمحوں میں تقسیم ہو کر وقت کی اکائی میں سمٹ جاتا ہے، مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں اِس اکائی سے اپنے کسی عمل کو الگ کر سکوں، میں گزرتے لمحوں کو روک سکتا ہوں اور نہ آنے والے لمحوں کے احتساب سے بچ سکتا ہوں۔ میں چاہوں یا نہ چاہوں، میری فردِ عمل مرتب ہو رہی ہے اور میرے دل میں یہ دھڑکا بیدار رہے کہ تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں کیا ہوگا؟

میں جو بیک وقت شاعر بھی ہوں اور ایک ایسا آدمی بھی جو اپنی پرچھائیوں میں بٹ چکا ہے۔ اِن پرچھائیوں میں اپنی وحدت کی تلاش اکثر مجھے اپنے آپ سے نبرد آزما رکھتی ہے اور شکست و ریخت کے اِس عمل میں اکثر وہ شاعر بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے جو میری روح کا استعارہ ہے اور میں عرصے تک اپنے بکھرے ہوئے ریزوں کو جمع کرنے اور انہیں پھر سے جوڑنے میں سرگرداں رہتا ہوں۔ یہ عرصہ مجھ پر ایک عذاب کی طرح گزرتا ہے۔

'آگ میں پھول' سے لے کر 'مٹی کا قرض' تک میں کتنی ہی بار اس روح فرسا اذیت سے گزرا ہوں اور خدا جانے ابھی کتنے کرب انگیز مراحل سے گزرنا باقی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ روح اور بدن کی اس جنگ میں میرا کیا حشر ہوگا میں پرچھائیوں میں بٹے ہوئے آدمی کے ملبے تلے دب کر رہ جاؤں گا یا اُس شاعر کو بچا لاؤں گا جو مر کر بھی زندہ رہنا چاہتا ہے جو فنا میں بھی ثبات کے خواب دیکھتا ہے اور ظہور کے نت نئے پیرائے تلاش کرتا رہتا ہے

ظہور کی یہی آرزو شاعر کو تجربوں پر اُکساتی ہے اور اس کے فن کو وقت کی رفتار سے ہم آہنگ رکھتی ہے لیکن فن کا وقت کی رفتار سے ہم آہنگ ہونا ہی شاعری کی خوبی نہیں ہے۔ شاعری جب تک تاریخ کے شعور سے روشن نہ ہو، اندھیرے میں چمکتے ہوئے جگنو کی طرح ہے۔ تاریخ کا شعور، شاعر کو عہد شناس بناتا ہے اور معاشرے میں اقدار کے جدلیاتی عمل سے آگاہ رکھتا ہے۔

شاعری اسی معنی میں اپنے عہد کی تنقید بھی ہے کہ وہ تاریخ کے تسلسل میں عصرِ رواں کا نہ صرف محاسبہ کرتی ہے بلکہ محاکمہ بھی کرتی ہے اور یہ محاکمہ ثابت کرتا ہے کہ شاعر کا اپنے زمانے سے رشتہ مجازی تھا یا حقیقی، جزوی تھا یا کُلّی۔۔۔ وہ گردوپیش کی دنیا میں صرف اپنی ذات کا سفیر تھا یا اپنے عہد کا وہ ہرکارہ بھی جو گھر گھر کا پیامبر ہوتا ہے، اس نے محض آبِ حیات پی کر خضر کی ابدیت کے خواب دیکھے یا وہ زہر بھی پیا ہے جو اپنی دھرتی کی محبت میں 'نیل کنٹھ' کو پینا پڑا تھا۔

حیاتِ ابدی کی لالچ میں تو سکندر نے بھی خضر کو رہنما کیا تھا اور اِسّر (راکھشش) بھی وہ امرت لے بھاگے تھے جو دیوتاؤں نے سمندر کو متھ کر نکالا تھا لیکن۔۔۔ زہر وہی پیتا ہے جسے اپنی مٹی عزیز ہوتی ہے۔

یہ مٹی کی محبت تھی جس نے آدم کو زمین پر اُتارا اور اپنی توہین کے انتقام پر اُکسایا۔ فطرت کی آتشیں قوت کے خلاف انسان کی جنگ جوازل سے آج تک زندگی کے مختلف مورچوں پر لڑی جارہی ہے، اِسی محبت کا اقرار ہے۔

شاعر اِس اقرار کو الفاظ عطا کرتا ہے اور ان الفاظ کو اپنے عہد کی آواز دے کر تاریخ کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھر تاریخ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اُس آواز میں صداقت کتنی تھی اور حسن بیان کتنا۔

میں نہیں جانتا کہ تاریخ کا فیصلہ میرے حق میں کیا ہوگا۔۔۔ میں جو صداقت کی تلاش میں اپنے کفن کا احرام باندھے کبھی اپنی ذات کا طواف کرتا ہوں اور کبھی اپنی دھرتی کا۔۔۔ اور ادب کی بارگاہ میں آواز دیے جاتا ہوں کہ میں حاضر ہوں۔۔۔ میں حاضر ہوں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

مٹی کا قرض

بعض شاعر ایسے ہوتے ہیں جو سوال اٹھاتے ہیں۔ ان کا جواب نہیں دیتے۔ بعض ان کہے سوالوں کا جواب دیتے ہیں اور بعض سوال و جواب کے اس قصے سے آزاد دل کی بات بیان کرتے رہتے ہیں۔

حمایت علی شاعر ان سخن وروں میں ہیں جو سوالوں کا جواب دیتے ہیں اور فکری استدلال کا سہارا لے کر شعر کو فکر کا وسیلہ بناتے ہیں۔ وہ سوال بھی اٹھاتے ہیں جواب بھی دیتے ہیں مجھے ان کے مجموعۂ کلام 'مٹی کا قرض' کو پڑھ کر یہی محسوس ہوا ہے۔

شاعر کا مرکزی سوال روح اور بدن کی جنگ سے متعلق ہے۔ یہی جنگ آگے چل کر فطرت اور انسان کی کشمکش بن جاتی ہے۔ اِس آویزش میں شاعر 'انسان، بدن اور مٹی کا طرفدار ہے بدن اور مٹی کا یہ اعلانِ جنگ، اپنے عہد کے شعور اور تاریخی حرکتِ ارتقائی کے حوالے سے ہے اور شاعر ہمیں باور کراتا ہے کہ بدن روح پر دھرتی آسمان پر اور انسان فطرت پر غلبہ پا کے رہے گا۔

شاعر نے اِن افکار کے لیے سورج (خورشید) چاند (مہتاب) چاندنی، دھوپ، نور، اُجالا اور شمع کو علامت بنایا ہے اور ان کے مقابلے میں تاریکی، اندھیرا۔۔۔ اور شب کو اور اِس تاریکی اور سکوت و خاموشی (سناٹا) کو بطور ضد استعمال کیا ہے۔

اِس آویزش میں قدرتی طور پر اندیشے اور خوف اور وسوسے بھی ابھرتے ہیں اور وحشت کی فضا بھی ہے جو شاعر کے داخلی المیے میں ایک معنی پیدا کرتی ہے۔

شاعر نے مٹی کے قرض، میں وطن اور خاکِ وطن کی پرستش کے واجبات کا بھی تذکرہ کیا

ہے اور اسے اپنی سرزمین کے بعض واقعات سے وابستہ کیا ہے۔

یہ ہے مجملاً Content جو حمایت علی شاعر کے اس مجموعے میں مختلف عنوان کے تحت بیان ہوا ہے اور میں اسے شاعر کا فکری مینی فیسٹو کہنا چاہوں گا۔ اپنے موضوع کی نثری تشریح دیباچے میں خود شاعر نے پیش کر دی ہے۔

'اپنی وحدت کی تلاش مجھے اپنے آپ سے نبرد آزما رکھتی ہے۔'

'تاریخ کا شعور شاعر کو عہد شناس بناتا ہے اور معاشرے میں اقدار کے جدلیاتی عمل سے آگاہ رکھتا ہے۔ 'شاعری۔۔۔ اپنے عہد کی تنقید بھی ہے'۔

'میں جو صداقت کی تلاش میں اپنے کفن کا احرام باندھے کبھی اپنی ذات کا طواف کرتا ہوں اور کبھی اپنی دھرتی کا۔۔۔ اور ادب کی بارگاہ میں آواز دیئے جاتا ہوں۔۔۔ کہ میں حاضر ہوں میں حاضر ہوں۔۔۔'

میں کہتا ہوں کہ اے شاعر تیری حاضری لکھ لی گئی۔۔۔

لیکن ذات اور دھرتی کے حقائق کی ابھی مزید جستجو کر۔ ابھی اُن کے معانی تک پہنچ۔ تیری وحدت تجھے مل جائے گی، ضرور مل جائے گی لیکن ذات کا قصہ کیا ہے؟ تیرا شعور ہے مگر حقیقی شعور کبھی دوئی اور ثنویت کا باعث نہیں ہوا۔ خودی کی وحدت حقیقی شعور ہی سے پیدا ہوتی ہے اور انا کی یہ آواز کوئی نئی نہیں، یہ آواز پہلے بھی اٹھی تھی، منصور حلاج کا شعور جب اس پل کے قریب پہنچا اور غیر منتہی کی سرزمین میں مسافر کو اتارا تو وہ یہ سمجھا کہ منتہی اب غیر منتہی ہو گئی ہے حالانکہ یہ صرف ایک پل تھا۔ وحدت کی سرزمین ابھی دور تھی لیکن جب بھی اس وحدت کو نقصان پہنچا، وہ اس تصور سے پہنچا کہ میں نے خود کو پیدا کیا۔ میں عقل رکھتا ہوں اس لیے میں خود ہی سیاہ و سپید کا مالک ہوں، ہر شے میری طاقت میں ہے۔ میں علیم ہوں، میں بصیر ہوں۔۔۔ میں ہی ہوں میں ہی ہوں!

مادہ پرست مفکر نے عقل کی پرواز میں کچھ اوپر اڑ کر یہ گمان کر لیا کہ اوپر کچھ نہیں۔ جو

کچھ ہے مٹی میں ہے، انسان کے بدن میں ہے، اس نے بھی نعرہ لگا دیا۔

سو یہ آواز نئی نہیں پرانی ہے مگر حقیقتِ کائنات پر (کہ انسان اس کا ایک حصہ ہے) غور کیا جائے (صرف عقل سے نہیں، شعور برتر سے بھی) تو یہ معلوم ہو گا کہ کائنات میں دوئی کہیں موجود ہی نہیں، دوئی نظر آتی ہے مگر اصل میں دوئی کوئی شے نہیں۔ کائنات کی حقیقت صرف یہ ہے کہ حقیقت مطلقہ کا خارجی روپ ہے۔۔۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو دوئی کی بات بے وزن، اور بدن و روح و نفس کی ثنویت ہوا ہو جاتی ہے۔

اب جب کہ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ مادہ کوئی جامد شے نہیں۔ اس کے باطن میں بھی کوئی شے حرکت کر رہی ہے جسے ہم اپنی تسلی کے لیے قوت یا انرجی کہہ دیتے ہیں تو بدن اور روح (جوہر) کی غیریت کی بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔

وائٹ ہیڈ جیسا ریاضی دان اعداد کی ثنویت اور کثرت کے بارے میں متشکک ہو چلا ہے۔۔۔ عدد صرف ایک ہے باقی اضافات ہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو دوئی اور جنگ کی باتیں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ہمارے باطن میں اگر اس قسم کی کوئی لڑائی ہے تو پرانے طبیعاتی تصور کے تحت ہے ورنہ شب کیا، اور دن کیا، خورشید کیا اور قمر کیا۔ جوہری ذرات ہیں جن سے کائنات کی وحدت مرتب ہوتی ہے۔

اس لحاظ سے عہد۔۔۔ من سے اور من۔۔۔ فطرت سے الگ کوئی شے نہیں۔۔۔ من کے آئینے میں عہد بھی ہے اور تاریخ بھی۔ غیریت وہاں نظر آتی ہے جہاں کوئی شخص من اور عہد اور کائنات کو حقیقت مطلقہ سے جدا کر کے دیکھتا ہے۔

اور جب یوں دیکھنے کی عادت پختہ ہو جاتی ہے تو اسے ہر طرف بیگانگی ہی بیگانگی نظر آتی ہے۔ ہر شے دوسری ہر شے کی دشمن۔۔۔ ایک انسان دوسرے انسان کا بیری۔۔۔ ذات کے اندر ہی نہیں، ذات کے باہر بھی ایک شدید آویزش اسے محسوس ہوتی ہے۔

اور یہی دانش افرنگ کی سب سے بڑی محرومی ہے کہ اس کے سارے معجزات علم و ہنر، اندر کو مجتمع نہیں کر سکے۔

شاعری کے ایک مجموعے پر اتنی سنگلاخ فکری گفتگو بعض کے لیے تعجب انگیز ہو گی مگر تعجب اس لیے نہ ہونا چاہیے کہ حمایت علی شاعر کا یہ شعری مجموعہ ہماری فکری شاعری کا نمائندہ ہے اس کے کلام میں فکری حقائق عمدہ شاعری بن کر نکلے ہیں۔۔۔! افکار نے تخلیقی پیکروں کی صورت اختیار کی ہے۔ اس لیے یہ شاعری بھی ہے اور فکر بھی! اور شاعر دونوں کے تقاضے پورے کر رہا ہے

'مٹی کا قرض' میں نظمیں بھی ہیں غزلیں بھی اور ثلاثیاں بھی

حمایت علی شاعر کی ثلاثیاں عام مثلثات سے یوں مختلف ہیں کہ ان میں رباعی کی طرح ایک مصرعہ برجستہ ایسا موجود ہے جس پر Stress دینے سے، ثلاثی کا مرکزی نکتہ سامنے آ جاتا ہے لیکن فنی ذوقیات کے اعتبار سے ثلاثی سے ایسا نکتہ برآمد کرنا جو چونکا دینے والا ثابت ہو، بمقابلہ رباعی مشکل ہوتا ہے۔

حمایت علی شاعر کی نظموں اور غزلوں کے درمیانی فاصلے کچھ زیادہ نہیں۔۔۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مفکر اور نکتہ آفریں فنکار ہے۔۔۔ آزاد نظم میں شاعر نکتے سے تصویر تک پہنچتا ہے۔۔۔ جو شاعر آزاد نظم میں بھی تخیلی نقاشی اور فضا سازی کے بجائے نکتہ آفرینی کو مرکزی اہمیت دے گا، وہ نظم میں غزل کی سی فنکاری کرتا ہے۔ حمایت علی شاعر کی نظم 'ہوا' اچھی خاصی غزل ہے، اور خود نظم 'مٹی کا قرض' بھی اچھی خاصی غزل ہے۔ مگر اس مجموعے میں عمدہ نظموں کی بھی کمی نہیں، مثلاً چاند، خورشید کا رازداں اور بگولا اچھی نظمیں ہیں۔

مٹی کا قرض میں عہد کے بعض واقعات کے جذباتی ردعمل بڑے توجہ خیز ہیں بابائے اردو اور حسن ناصر کی یاد میں جو کچھ لکھا ہے، اسے لہو میں پھول اگانے کے مترادف کہا جا سکتا ہے۔

حمایت علی شاعر کو میں جب پسند کرنے لگا تھا تو ان کی غزل کے طفیل غائبانہ ذہنی

ملاقات کا واقعہ پیش آیا۔ میں میر تقی میر کے عقیدت مندوں میں سے ہوں اور مجھے حمایت علی شاعر کی یہ بات اچھی لگی تھی کہ وہ بھی میر پسند ہیں بلکہ باانداز میر لکھتا ہے۔ موجودہ مجموعے میں بھی میر کے مزار پر جلائے ہوئے چراغ روشن نظر آتے ہیں۔

شاعر کی غزل میں وہ بات جسے نکتہ کہا جاتا ہے اکثر ملتا ہے۔ نکتہ کسی حقیقت کے بیان کو کہتے ہیں جس سے زندگی کے بارے میں کچھ عرفان ملتا ہو مگر کہنے کا انداز ایسا ہو جس میں ثقل نہ ہو، اور طرز بیان ایمائی ہو۔

اس معاملے میں میرا ایک شخصی معیار ہے۔۔۔ اور وہ یہ کہ نکتے والا شعر اگر پڑھتے ہی یاد ہو جائے تو میں اسے بلاخوف اچھا شعر کہہ دیتا ہوں میں نے چند ایسے اشعار کا انتخاب کیا ہے جو میری بیاض میں درج ہو گئے ہیں۔

میں اُن اشعار کا احسان مانتا ہوں کہ اُن سے میرے جذبے کو فیض ملا ہے۔

اب ایک ذاتی بات۔۔۔ حمایت علی شاعر میرے لیے ایک مانوس شخص تھا۔ وہ مجھ سے ملا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ جس کا نام 'مٹی کا قرض' تھا۔ عنوان سے مجھے غلط فہمی ہوئی۔ میں اسے محض کومٹمنٹ کی کتاب سمجھا۔ پھر میں نے اسے بادل نخواستہ پڑھا اور پڑھتا چلا گیا۔۔۔ مگر ہر ورق گردانی نے خیال گردانی کی۔ اِس بے رنگ عنوان کے نیچے سے ایک اور کتاب نکل آئی جسے اگر کتاب فکر رنگیں کہہ دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا اگر میں شاعر کی جگہ ہوتا تو کتاب کا نام 'شاعر کے چراغ' رکھتا۔ مٹی کا قرض بڑا خشک عنوان ہے۔

ایک اسی طرح کی بات دیباچے کے بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس رسم سے اب تک مانوس نہیں ہو سکا کہ شاعر اپنی شاعری کے فکری حصے پہ دیباچہ خود لکھے کیونکہ اس کے بعد نقاد کے پاس کچھ نہیں رہتا۔

تو مطلب یہ کہ میرا نصف دل دیباچے سے ناخوش رہا۔۔۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ

اسی دیباچے سے مجھے شاعر کی شخصی جذباتی کیفیت کا پتہ چلا۔۔۔اور اتنا تو میں روا رکھتا ہوں بلکہ اسے پسندیدہ سمجھتا ہوں کہ شاعر اپنی جذباتی شخصیت کے کوائف سے قاری کو ضرور آگاہ کرے تاکہ اس کی شاعری کے سمجھنے میں مدد ملے۔

(مطبوعہ 'اوراق' لاہور۔اپریل، مئی۔۱۹۷۵ء)

گفتنی ناگفتنی

بہت دنوں سے میں خاموش تھا خدا کی طرح
زمیں میں گاڑے ہوئے سنگِ رہنما کی طرح

میں اپنی ذات کے صحرا میں کھو گیا تھا کہیں
صدائیں دیتا تھا دل، نالۂ دِرا کی طرح

ہوا کی زد میں تھا گویا چراغ راہگزر
پڑا ہوا تھا سرِ راہ، نقشِ پا کی طرح

یہ کون عکس کے مانند رُو برو آیا
میں خیرہ چشم، وہ خورشید کی ضیا کی طرح

یہ میرے دل کی ہے دھڑکن کہ فکر کی آواز
کوئی صدا سی ہے جبریل کی صدا کی طرح

یہ میری خلوتِ دل ہے کہ جلوتِ کونین
یہ میری ذات میں ہے کون ماسوا کی طرح

کھلی کتاب کے مانند کائنات تمام
نظر ہے خلوتیِ گوشۂ حِرا کی طرح

کھلا کہ 'لا' ہی حقیقت ہے، 'لا' ہی افسانہ
عدم وجود میں پوشیدہ ہے خدا کی طرح

بس اِک تسلسلِ جذب و گریز جاری ہے
ہر انتہا نظر آتی ہے ابتدا کی طرح

یہ آسمان، ازل سے بہ فیضِ کم نگہی
زمیں کے دوش پہ ہے پیرِ تسمہ پا کی طرح

عجب ہے نشۂ خود آگہی کہ دنیا میں
ہر اجنبی نظر آتا ہے، آشنا کی طرح

کسے خبر کہ ہے کیا ربطِ ظاہر و باطن
پہن کے بیٹھے ہیں سب جسم کو قبا کی طرح

اگر اُڑوں بھی تو سایہ زمین ہی پہ رہے
تو کیوں اُڑوں میں ہوائے گریز پا کی طرح

وہ بستیاں تھیں تو کیوں مجھ کو یہ ہوا محسوس
میں جنگلوں میں بھٹکتا پھرا ہوا کی طرح

اسیر ہے دلِ وحشی بدن کے زنداں میں
حیات کاٹ رہا ہوں، مگر سزا کی طرح

زمیں پہ پاؤں نہیں اور آسماں پہ دماغ
یہ 'ہجرتی' بھی ہیں بس سایۂ خدا کی طرح

میں اپنے آپ سے مصروفِ جنگ ہوں شاعر
لہولہان ہے دل، دشتِ کربلا کی طرح

O

آدمی تھا، تم بنا بیٹھے خدا پیکر مجھے
میں تمہارا آئینہ تھا، کر دیا پتھر مجھے

میں نے جو کچھ بھی کہا، معنی کی صورت میں کہا
تم سمجھ بیٹھے مگر الفاظ کا دفتر مجھے

میری مٹی نے دیا تھا مجھ کو میرا رنگ روپ
ڈھالتی جاتی ہے دنیا اپنی صورت پر مجھے

میں کہ میری خاک کی لَو سے ہوا میرا ظہور
کاش ڈھونڈے کوئی میری خاک کے اندر مجھے

میرا ہر نقشِ کفِ پا صفحۂ تاریخ ہے
تم مورّخ ہو تو لکھو ہر قدم پڑھ کر مجھے

میں نے سوچا، میں نے سمجھا اور میں نے کہہ دیا
تم نے سوچا اور نہ سمجھا کہہ دیا کافر مجھے

میں ہوں اپنی روح پر لادے ہوئے 'مٹی کا قرض'
کوئی شاعر کہہ رہا ہے، کوئی پیغمبر مجھے

آرائشیں جدا سہی، بنیاد ایک ہے
کعبے سے مختلف نہیں پتھر کنشت کا

حمایت علی شاعر

’یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری‘

ثلاثی

الہام

کوئی تازہ شعر، اے ربِّ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر، محوِ انتظارِ جبرئیل

اسلوب

کس طرح تراش کر سجائیں
نادیدہ خیال کے بدن پر
لفظوں کی سلی ہوئی قبائیں

شاعری

ہر موجِ بحر میں کئی طوفاں ہیں مشتعل
پھر بھی رواں ہوں، ساحلِ بے نام کی طرف
لفظوں کی کشتیوں میں سجائے، متاعِ دل

اساس

کب ہوا کی کوئی تحریر نظر میں آئی
گر زمیں ہو، تو ہر اِک بیج میں امکان شجر
بے زمیں ہو، تو ہر اِک نقش نمو ہے کائی

علم

مرنا ہے تو دنیا میں تماشا کوئی کر جا
جینا ہے تو اِک گوشۂ تنہائی میں اے دل
معنی کی طرح لفظ کے سینے میں اُتر جا

حرفِ آخر

ہر لفظ میں پوشیدہ ہے خود اپنا جواز
ایماں میں نہ کیوں علم ہو شرطِ اول
'اقراء' ہے نبوت کا بھی حرفِ آغاز

حسنِ تحریر

یہ عظمتِ قلم کی اِک ادنیٰ دلیل ہے
لب بستگی کو حرفِ سخن یوں عطا ہوا
پتھر ہی راستے کا سہی، 'سنگِ میل' ہے

یقین

دشوار تو ضرور ہے یہ سہل تو نہیں
ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرارِ شہرِ علم
ہم ابنِ جہل ہی سہی، 'بوجہل' تو نہیں

خودفریبی

الفاظ کے طواف میں اربابِ علم ہیں
لیکن یہ بات اہلِ مدارس سے کیا کہیں
یہ علم تو نہیں، فقط آدابِ علم ہیں

انکشاف

عالم تھے، باکمال تھے، اہلِ کتاب تھے
آنکھیں کھلیں تو اپنی حقیقت بھی کھل گئی
الفاظ کے لحاف میں ہم محوِ خواب تھے

زاویۂ نگاہ

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اِسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اِسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

دسترس

کس نے کمند پھینکی ہے روح الامین پر
میں سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا، قریب ہی
بادل کا سایہ رینگ رہا تھا زمین پر

مابعدالطبیعات

حرف و رنگ و صوت سب اظہار کے آداب ہیں
ماورائے ذہن ہر تمثیل، ہر کردار میں
آدمی کی آرزو ہے، آدمی کے خواب میں

ارتقاء

یہ اوج، بے فراز ہے آوارہ بادلو
کونپل نے سر اُٹھا کے بڑے فخر سے کہا
پاؤں زمیں میں گاڑ کے سوئے فلک چلو

انتباہ

مغرور ہوا سے کہو، یہ بات نہ بھولے
جم جائیں تو بن جاتے ہیں اِک کوہِ گراں بھی
ویرانوں میں اُڑتے ہوئے آوارہ بگولے

ارتفاع

اپنی زمیں کا حسن تھا اپنی نظر سے دور
دنیا کو ماہتاب سے دیکھا تو یہ کھلا
ہم ہوں اگر بلند تو یہ خاک بھی ہے نور

زندگی

دھوپ کے پیچھے سایہ بھاگے، دن کے پیچھے رات
آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں ثابت اور سیار
سب کی ایک تمنا لیکن، کوئی نہ آئے ہاتھ

جدلیات

مخلوق بھی حیات کا خلّاق بھی ہوں میں
میرے تضاد سے ہے عبارت مرا وجود
گر زہر ہوں تو زہر کا تریاق بھی ہوں میں

تناسخ

اگرچہ قبر میں شب کی، اُتر گیا خورشید
زمیں اُجالے سے پھر بھی نہ ہوسکی محروم
مہ و نجوم کی صورت اُبھر گیا خورشید

شرط

شب کو سورج کہاں نکلتا ہے
اِس جہاں میں تو اپنا سایہ بھی
روشنی ہو تو ساتھ چلتا ہے

تعلق

کچھ بھی نہیں ہے، فرق سفید و سیاہ میں
پھوٹی ہے جب بھی کوئی کرن، رات ہو کہ دن
سائے نکل پڑے ہیں، اُجالے کی چاہ میں

خوش فہمی

خوش ہے سورج کہ کٹ گئی ہے رات
کاش یہ بھی اُسے خبر ہوتی
سائے سائے میں بٹ گئی ہے رات

دوسرا رخ

سورج کا یہ انداز گواہی تو نہیں ہے
آئینہ دکھاتا ہے اُجالا مجھے پیہم
سایہ، مرے اندر کی سیاہی تو نہیں ہے

المیہ

مجھ کو محسوس ہو رہا ہے یوں
اپنی صورت میں ہوں نہ دنیا میں
زنگ آلود آئینے میں ہوں

بے کسی

کون دنیا میں رفیقِ غمِ جاں ہوتا ہے
دل میں جاگ اُٹھتا ہے جب بھی کوئی سویا ہوا درد
قطرۂ اشک بھی پلکوں پہ گراں ہوتا ہے

دانشور

ہم کہ روشن ظلمتوں میں شمع کی صورت ہوئے
خوش قدوں کے درمیاں پگھلے خود اپنی آگ میں
اور ہم ہی انجمن میں سب سے کم قامت ہوئے

ابن الوقت

سورج تھا سر بلند تو محوِ نیاز تھے
سورج ڈھلا تو دل کی سیاہی تھی دیدنی
کوتاہ قامتوں کے بھی سائے دراز تھے

کرسی

جنگل کا خونخوار درندہ، کل تھا مرا ہمسایہ
اپنی جان بچانے، میں جنگل سے شہر میں آیا
شہر میں بھی ہے میرے خون کا پیاسا اِک 'چوپایہ'

رویتِ ہلال

خود آگہی نہ جدتِ فکر و نظر ملی
وہ قوم آج بھی ہے پرستار چاند کی
جس قوم کو روایتِ 'شق القمر' ملی

ذوقِ تعمیر

ہم میں وہ شوقِ عبادت اب کہاں
ہر محلے میں بناتے ہیں، مگر
اے خدائے لامکاں، تیرا مکاں

نمائش

قرآں، خدا، رسول ہے، سب کی زبان پر
ہر لفظ آج یوں ہے معانی سے بے نیاز
جیسے لگی ہو نام کی تختی مکان پر

تضاد

اہلِ اسلام میں نہیں طبقات
اور فرما رہے تھے مولانا
اہلِ ثروت پہ فرض ہے خیرات

مساوات

زندگی بھر تو نہیں، ہاں مگر اِک وقتِ نماز
اپنے ایماں کی سرِ عام نمائش کے لیے
'ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز'

کششِ ثقل

آزاد کب ہوا کوئی قیدِ مقام سے
جالندھری ہے کوئی تو کوئی ہے لکھنوی
ترکِ وطن کے بعد بھی نسبت ہے نام سے

نظم

اب راستے میں زیست ملے یا اجل پڑے
تم سوچ کر اٹھاؤ قدم، ہم تو چل پڑے

تجدید

وقت، آوارہ ہوا کے مانند
شعلۂ جسم ہے، شبنم کی طرح
آ، مٹا دیں یہ تفاوت، یہ جمود
آ، کہ ہو پھر کسی عیسیٰ کا ورود
تو بھی مظلوم ہے مریم کی طرح
میں بھی تنہا ہوں، خدا کے مانند

اُردو اور بابائے اُردو

جیسے آغوشِ محبت میں ہمکتی ہوئی ننھی بچی
اپنے بابا کو کسی فکر میں ڈوبا ہوا پا کر، خود بھی
کھیلتے کھیلتے چپ چاپ کسی سوچ میں کھو کر رہ جائے
اور پھر باپ کی پلکوں پہ لرزتا ہوا کوئی آنسو
اپنی بچی کے کھلے پھول سے رخسار پہ گر کر بہہ جائے

○ یہ نظم پہلی بار اسی عنوان سے ماہنامہ 'الشجاع' کراچی (عبدالحق نمبر) اگست ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ (شاعر)

سمندراورانسان

قلزمِ بیکراں! ترا پھیلاؤ
زندگی کے شعور کا غماز
تیری موجوں کا پر سکون بہاؤ
زندگی کے سرور کا غماز
تیرے طوفان کا اُتار چڑھاؤ
زندگی کے غرور کا غماز

سوچتا ہوں کہ تیری فطرت سے
میری فطرت ہے کتنی ہم آہنگ
تیری دنیا ہے کتنی بے پایاں
میری دنیا ہے کیسی رنگا رنگ
تو ہے کتنا وسیع اور محدود
میں ہوں کتنا وسیع، کتنا تنگ

میرے ماتھے پہ کتبۂ تقدیر
تیری موجیں ترے لیے زنجیر

ہَوا

جو دور رہ کر بھی نزدِ جاں ہے
نفس نفس میں رواں دواں ہے

ازل سے محوِ سفر ہے اب تک
حیات کی رہگزر ہے اب تک

لطیف اتنی کہ یادِ یاراں
کثیف اتنی کہ دشمنِ جاں

ہر ایک رازِ دروں کی محرم
کوئی تغیر ہو ایک عالم

ہزار انداز سے عیاں ہے
مگر ہر اِک آنکھ سے نہاں ہے

کبھی گماں ہے، کبھی یقیں ہے
کہیں یہی تو خدا نہیں ہے

تضاد

میں سوچتا ہوں
میں ایک انساں ہوں، ایک مشتِ غبار ہوں میں

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا
کہ ایک آواز سرسرائی فضا کی خاموش وسعتوں میں
میں چونک اُٹھا
پلٹ کے دیکھا
کوئی ہوائی جہاز پرواز کر رہا تھا
جو لمحہ لمحہ بلندیوں کی طرف رواں تھا
میں اُس کو تکتا رہا مسلسل

نہ جانے کب تک۔۔۔
نہ جانے اِس لمحۂ گریزاں کے تنگ دامن میں
کتنی صدیاں سمٹ گئی تھیں
نہ جانے میری نظر میں کتنے نئے اُفق جگمگائے
کتنے ہی چاند سورج اُبھر کے ڈوبے
نہ جانے وہ کون سا جہاں تھا
زمیں، کہ پیروں تلے کوئی فرشِ زر ہو جیسے
فلک، کہ سر پر ردائے آبِ گہر ہو جیسے
فضا، منوّر
ہوا، معطر
نفس نفس میں بسی ہوئی نکہتِ گلِ تر
خلاؤں میں مشتری وزہرہ کا رقص جاری
تمام عالم پہ ہلکا ہلکا سرور طاری

نہ جانے میں کس خیال میں گم
کس ابر پارے پہ اُڑ رہا تھا
غرور سے سر بلند کر کے ہر اِک ستارے کو دیکھتا تھا

کہ ایک دلدوز چیخ گونجی فضا کی خاموش وسعتوں میں
میں چونک اُٹھا
پلٹ کے دیکھا
گلی سے اِک ہڈیوں کا ڈھانچہ گزر رہا تھا
جو چیخ کر ایک اِک سے کہتا تھا
'ایک روٹی، خدا تمہارا بھلا کرے گا'

نوٹ: یہ نظم جولائی ۱۹۶۰ء میں اِسی عنوان سے 'ادبی دنیا' لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ 'مٹی کا قرض' کے پہلے ایڈیشن میں اس کا عنوان 'بگولہ' کر دیا گیا جو مناسب نہیں تھا۔ (شاعر)

آدمی

کل بھی میں جنگل میں تھا اور آج بھی جنگل میں ہوں
کل مرے ہمسائے تھے خونی درندے، بھیڑیئے
آج انسانوں میں ہوں اور خون کے جل تھل میں ہوں
مجھ کو تہذیبوں نے آئینہ دکھایا تو کھلا
روح کا قاتل ہوں میں اور جسم کے مقتل میں ہوں

سنگ میل

میرے سینے کے دہکتے ہوئے انگارے کو
اب تو جس طرح بھی ممکن ہو بجھا دے کوئی
اپنی آنکھوں میں بھی ہوں، آنکھ سے اوجھل بھی ہوں
میں گماں ہوں کہ حقیقت ہوں، بتا دے کوئی
دھوپ چھاؤں کا یہ انداز رہے گا کب تک
مجھ کو اِس خواب کے عالم سے جگا دے کوئی

میں ہوں اِس دشتِ طلسمات کا وہ شہزادہ
جس کے سر پر ہے فلک، گنبد بے در کی طرح
میری منزل، مرے سینے پہ لکھی ہے لیکن
اپنی ہی راہ میں ہوں نصب، میں پتھر کی طرح

رہنما ہوں مگر اِک گام نہیں چل سکتا
ایسی اِک ضرب کہ ٹوٹے یہ مسلسل سکتہ

جواب

سورج نے جاتے جاتے بڑی تمکنت کے ساتھ
ظلمت میں ڈوبتی ہوئی دنیا پہ کی نظر
کہنے لگا کہ کون ہے اب اِس کا پاسباں
میرے سوا ہے کون زمانے کا راہبر
میں تھا تو اپنی راہ پہ تھی گامزن حیات
اب میں نہیں رہوں گا تو یہ ساری کائنات
ظلمات میں بھٹکتی پھرے گی تمام رات

سورج یہ کہہ کے جا ہی رہا تھا کہ اِک دِیا٥
چپکے سے جل اُٹھا اور اُسے دیکھنے لگا

٥ رابندناتھ ٹیگور کا خیال علامہ اقبال کے اس مصرعے کی روشنی میں۔ (شاعر)
'تو شب آفریدی چراغ آفریدم'

ایک منظر۔۔۔ایک سوچ

کہکشاں کی جگمگاتی فصل لہرائی ہوئی
دور، اُفق کی اوٹ سے محوِ نظارہ ماہتاب
شب کسی اندیشۂ فردا سے کجلائی ہوئی

سوچتا تھا، یہ چمکتی فصل جب کٹ جائے گی
دامنِ مہتاب میں کھل جائیں گے چاندی کے پھول
رات کے ماتھے سے گردِ تیرگی چھٹ جائے گی

سوچتا تھا میں کہ دیکھا، رات ساری کٹ گئی
ایک سورج ناگہاں اُبھرا بصد جاہ و جلال
چاند کی دولت، سحر کے غاصبوں میں بٹ گئی
سورج اپنی کامرانی پر بہت مغرور ہے
سوچتا ہوں، اِس سحر سے شام کتنی دور ہے

یہ نظم پہلے مارشل لا پر ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد دکن (جولائی اگست ۱۹۵۹ء) میں شائع ہوئی تھی۔

اندیشہ

سہمی سہمی کھل رہی تھی اِک کلی
میں نے پوچھا
کیا خزاں کا خوف ہے؟
جی نہیں، اِک دن خزاں تو آئے گی
پھر؟
سنا ہے۔۔۔(اُس نے چپکے سے کہا)
اِس چمن کا باغباں گلچیں بھی ہے

سناٹا

اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے سرمایۂ ہوش
رات اِک چور کے مانند گزرتی ہے خموش

اتنا گہرا ہے اندھیرا کہ جدھر آنکھ اُٹھے
اپنی ہی کور نگاہی کا گماں ہوتا ہے
دور و نزدیک مسلّط ہے وہ غمناک سکوت
جو کسی قبرِ شکستہ میں نہاں ہوتا ہے

آسماں کوئی مجاور ہے کہ بیٹھا ہے خموش
کوئی اندیشۂ فردا ہے، نہ فکرِ غمِ دوش

کوئی بجلی، کوئی تارا، کوئی جگنو، کوئی شمع
کوئی ایسا نہیں جو نور کا عنواں بن جائے
کوئی خورشید بھی اِس شب کے تعاقب میں نہیں
کون اِس مقبرۂ زیست کی تقدیر جگائے

رات اِک چور کے مانند گزرتی ہے خموش
اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے سرمایۂ ہوش

کامریڈ حسن ناصر

(جسے لاہور قلعہ میں فیلڈ مارشل صدر ایوب خان نے قتل کروادیا)

میری آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے آخر
میری آنکھیں جو زمانہ ہوا اپنے آنسو
اپنے ارمانوں کی تربت پہ لٹا بیٹھی ہیں
اپنے خوابوں کے شگفتہ سے گلوں کی خوشبو
اپنے گلچیں کی عنایت پہ لٹا بیٹھی ہیں
میری آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے آخر

میرے ہمدم، مری پلکوں پہ لرزتے ہوئے اشک
میرے دامن میں ندامت سے ٹپک جاتے ہیں
میرے ادراک و عزائم کے سرافراز ستون
تیری عظمت کے تصور سے لچک جاتے ہیں

سوچتا ہوں کہ مرے دل کا وہ شعلہ ہے کہاں
جو ہر اِک دور میں تابندہ و پرنور رہا
کوئی آندھی، کوئی طوفاں جسے گُل کر نہ سکا
کبھی فیوچک، کبھی زویا، کبھی منصور رہا

آج اخبار کی سرخی پہ نظر پڑتے ہی
میرے اندر سے کوئی مہر بہ لب چیخ پڑا
میرے جذبات کی غیرت، میرے ہونٹوں کا سکوت
میرا فن چیخ پڑا، میرا ادب چیخ پڑا

یہ زمیں حق کی پرستار ہے، باطل باطل
سینۂ حق سے صدا آتی ہے، قاتل قاتل

دھڑکا

اور کچھ تیز کرو شمع کی لو

وقت کیا جانے خبر کیا لائے
سنسناتی ہیں ہوائیں ہر سمت
پتیاں تال دیئے جاتی ہیں
رقص کرتی ہیں بلائیں ہر سمت
کس کو معلوم کہ کیا ہو جائے
سہمی سہمی سی ہے لمحات کی رو
اور کچھ تیز کرو شمع کی لو

تیرگی حدِ نظر تک ہے محیط

کوئی تارا کوئی جگنو بھی نہیں
اِک فقط برق چمک جاتی ہے
اِس اندھیرے پہ نشانہ باندھے
تیر کی طرح لپک جاتی ہے
ایسے عالم میں بھلا کیا ہو یقیں
کس طرف جائے گی دنیائے بسیط
تیرگی حد نظر تک ہے محیط

اور کچھ تیز کرو شمع کی لو

آج کی رات بہت بھاری ہے
دور تک کوئی نہیں راہِ نجات
اِس گھڑی فاصلہ و قیدِ حدود
زیست کے حق میں ہے تحقیر کی بات
موت کی ضرب بہت کاری ہے
تھم نہ جائے کہیں جذبات کی رو
اور کچھ تیز کرو شمع کی لو

مٹی کا قرض

ہم کہ مشتِ خاک ہیں
خاک کی اِملاک ہیں
خاک، جس کا نم، لہو
خاک، جس کا رم، نمو
خاک کا آہنگ، صَوت
خاک چپ ہو جائے، موت
خاک کی میزان، وقت
خاک کا وجدان، وقت
خاک کا امکاں، وجود
خاک ہی بود و نبود

ہر عمق، ہر ارتفاع
خاک کا خطِّ شعاع
خاک، بطنِ خیر و شر
خاک ہی اُمِ بشر
نقشِ دستِ آزری
خاک کی صورت گری
جلوۂ شمس و قمر
خاک کا حسنِ نظر
زندگی کا ہر شعار
خاک سے ہے مستعار

ہم کہ اپنی خاک کے
اپنی خاکِ پاک کے
آپ صورت گر بھی ہیں
بت بھی ہیں آذر بھی ہیں
خواب بھی، تعبیر بھی
رنگ بھی، تصویر بھی

لفظ بھی، آہنگ بھی
مانی و ارژنگ بھی
روپ بھی، درپن بھی ہم
دل بھی ہم، دھڑکن بھی ہم
در بھی ہم، روزن بھی ہم
تیرہ بھی، روشن بھی ہم
خاک، یہ خاکِ وطن
یہ متاعِ جان و تن
مہرباں، گھر کی طرح
ماں کی چادر کی طرح
ہم پہ جو کچھ فرض ہے
خاک ہی کا قرض ہے

لہو

(۱۹۶۵ء)

لہو جو سرحد پہ بہہ چکا ہے
لہو جو سرحد پہ بہہ رہا ہے
ہم اُس لہو کا خراج لیں گے

یہ خون، سرمایۂ وطن ہے
یہ خون، رنگِ رخِ چمن ہے
یہ خون، ہر ماں کے دل کی دھڑکن
یہ خون، ہر باپ کا بدن ہے

یہ خون، بہنوں کے سر کی چادر
یہ خون، بھائی کا بانکپن ہے
یہ خون، دلہن کا خوابِ رنگیں
یہ خون، بچّوں کا بھولپن ہے
یہ خوں، جوانی کی کج ادائی
یہ خوں، بڑھاپے کا سارا دھن ہے
یہ خون، دہقان کا پسینہ
یہ خون، ہر کھیت کی پھبن ہے
یہ خون، محنت کا آبگینہ
یہ خون، مزدور کی لگن ہے
یہ خون، افکار کا اُجالا
یہ خون، نغمہ ہے، علم و فن ہے
یہ خون، تہذیب کی امانت
یہ خون، حسنِ ہر انجمن ہے
یہ خون، سرمایۂ وطن ہے
یہ خون، سرحد پہ بہہ رہا ہے
یہ خون، ہم سب سے کہہ رہا ہے

ہم اُس لہو کا علم بنا لیں
سنان و سیف و قلم بنا لیں
اِسے سمجھ لیں متاعِ ہستی
اور اپنی روحوں کا غم بنا لیں
خلوص و مہر و وفا کا حاصل
نگاہ و دل کا حرم بنا لیں
خیال و خواب و عمل کی منزل
قدم کا اندازِ رم بنا لیں
وطن کو دے کر مقامِ کعبہ
اِسی کو احرام ہم بنا لیں
یہ آئینہ کر کے اور صیقل
اِسی کو اِک جام جم بنا لیں
یہ خون ماتھے پہ مَل کے نکلیں
اِسے نشانِ حشم بنا لیں
جو نقش اِس نے بنا دیا ہے
اُسی کو نقشِ قدم بنا لیں
برس پڑیں دشمنوں کے سر پر

وطن کو تیغ دو دم بنا لیں
ہم اِس لہو کا علم بنا لیں
وطن کے بیدار سورماؤ
اُٹھاؤ اپنا علم اُٹھاؤ

جہاں پہ کر دیں یہ آشکارا
ہمیں غلامی نہیں گوارا
کوئی اِدھر بھول کر نہ آئے
یہ دیس ہم کو ہے سب سے پیارا
یہ خاک وردی ہے ہر جری کی
یہ خون، پرچم ہے اب ہمارا
یہی ہلال، ایک تیغ بھی ہے
یہی ستارہ ہے اِک شرارا
جو ہم پہ یلغار کرنے آئے
وہ آ نہ پائے گا یوں دوبارا
حصار کھینچیں گی یہ چٹانیں
بڑھے گا راوی کا تیز دھارا

وہ آگ برسے گی آسماں سے
زمیں پہ دوزخ کا ہو نظارا
ہر ایک للکار، صور ہو گی
دھماکا ہو گا، ہر ایک نعرا
وہ رن پڑے گا، وہ جنگ ہو گی
کہ بھاگنے کا نہ ہو گا یارا
جہاں پہ کر دیں یہ آشکارا
ہم اُس لہو کا خراج لیں گے

لہو جو سرحد پہ بہہ چکا ہے
لہو جو سرحد پہ بہہ رہا ہے

۶۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ یہ جنگ ۱۷ دن جاری رہی اور 'معاہدہ تاشقند' پر ختم ہوئی۔ (شاعر)

مارچ پاسٹ

(۱۹۷۱ء)

سپاہی جنگ پر چلے ہیں کتنی آن بان سے
بدن پہ وردیاں سجائے کس عجیب شان سے
تڑپ کے دیکھتی ہے صبح جھک کے آسمان سے
جوان جا رہے ہیں آج، آپ اپنی جان سے
نبرد آزما ہے کون، پردۂ مجاز میں
نہ جانے کتنے راز ہیں نہاں اِس ایک راز میں

ہوائیں چپ، فضائیں چپ، زمین آسمان چپ
خلا میں تک رہا ہے آنکھ اُٹھائے ہر مکان چپ
ہجوم در ہجوم لوگ اور ہر زبان چپ
ہر ایک سمت حشر کا سماں مگر ہیں کان چپ
کسے خبر، سنور رہے ہیں یا بکھر رہے ہیں ہم
بڑے عجیب امتحان سے گزر رہے ہیں ہم

یہ جنگ کس کی جنگ ہے، خود اِس وطن سے پوچھیے
وطن سے دور 'دوستوں کی انجمن' سے پوچھیے
جبیں جبیں پہ مضطرب، شکن شکن سے پوچھیے
خدا بنا ہوا ہے جو اُس 'اہرمن' سے پوچھیے
ہوائیں چیختی پھریں، انارکی، انارکی
یہ زرگری کی جنگ ہے، یہ جنگ اقتدار کی

○ مشرقی پاکستان پر جنرل یحییٰ خان کی فوجی یلغار، جس کی بنا پر وہاں علیحدگی کی تحریک چلی اور ۱۹۷۲ء میں 'بنگلہ دیش' بن گیا۔ (شاعر)

لمحۂ فکر

تم بھی فریب خوردہ ہو ہم بھی تھے بے خبر
دونوں ہی باشعور نہ تھے قصہ مختصر
تاریخ ہر قدم پہ دکھاتی تھی آئینہ
تاریخ کا مذاق اُڑاتے تھے دیدہ ور
اب زخمِ سر کھلا تو ملا سنگ کا سراغ
پتھر سے بے نیاز تھا ہر ایک شیشہ گر

پتھر، کہ حرف و صوت بھی نقش و نگار بھی
پتھر، کہ رنگِ رخ بھی، لہو کا خمار بھی
پتھر، بلند و پست کا خود ساختہ نظام
پتھر، زمیں کا غم بھی، فلک کا وقار بھی
پتھر، خدا کے نام پہ تکبیرِ ناخدا
پتھر ہی سنگِ میل بھی، سنگِ مزار بھی

ہر اِک قدم پہ سنگ کو نسبت تھی سر کے ساتھ
اور سائے کی تلاش میں ہم تھے شجر کے ساتھ
سوچا نہ تھا کہ سایہ ہے سورج کا ہم سفر
سورج مگر نہیں ہے کسی ہم سفر کے ساتھ
خوابوں کی دھوپ چھاؤں میں افلاک کے تلے
تھا رقصِ گردباد، نہایت ہنر کے ساتھ

یہ آگہی کا نور کہ خیرہ ہے چشمِ دل
احساسِ تیرگی کہ ہے تابندگی خجل

دل ہے لہو لہو تو جگر داغ داغ ہے
افکار گرد گرد ہیں، جذبات مشتعل
گردوں دھواں دھواں ہے فضا ہے شرر شرر
سَر ہیں ہَوا کے دوش پہ اور روح پا بہ گِل

اِس معرضِ فنا میں ذرا کل کی سوچیے
جینے کی آرزو میں نہ مقتل کی سوچیے
'سومل' کا پیرہن تو نظر کا فریب تھا
'رانو' کی فکر کیجیے، 'مومل' کی سوچیے
مالیر، 'ماروی' کا رہے گا سدا ○ مگر
صدیوں کے ارتباط میں اِس پَل کی سوچیے

○ سندھی مہاجر اتحاد زندہ باد

پسِ دیوارِ حرف

(لسانی فسادات پر)

کس کو قاتل کہوں، کس کو بسمل کہوں
یہ مرا دوست ہے، وہ مرا بھائی ہے
اپنی تاریخ سے گر اِسے پیار ہے
اپنی تہذیب کا وہ بھی شیدائی ہے
بے زبانی کا ہے یہ بھی مارا ہوا
وہ بھی اپنی زباں کا تمنائی ہے

میں کہ دونوں ہی میرے لیے جان و دل
میری نظروں میں دونوں ہی معصوم ہیں
وقت کا جبر کہیے کہ تاریخ کا
وہ بھی مظلوم تھے، یہ بھی مظلوم ہیں
وہ کہ اُن کے سروں پر ہے مٹی کا قرض
یہ زمیں کی رفاقت سے محروم ہیں

آسماں لاکھ سر پر ہو سایہ فگن
زندگی ماسوائے زمیں کچھ نہیں
گر یقیں ہو تو ہر اِک تصور حسیں
اور گماں ہو تو دنیا و دیں کچھ نہیں
جس کا ماضی نہ ہو، اُس کا فردا ہی کیا
دور تک اِک خلا ہے، کہیں کچھ نہیں

ایسے عالم میں درکِ حقیقت ہو کیا
فکر گنجلک، نظر تنگ، دل بدگماں
حرفِ حق، ایک پیرایۂ مکر و فن
مصلحت، معنی و لفظ کے درمیاں
عکس در عکس افسونِ آئینہ ساز
شکل در شکل بہروپیے مہرباں

کون جانے پس آئینہ کون تھا
کون سوچے کہ پیش نظر کون ہے
روپ بہروپ میں ربط پنہاں ہے کیا

دستِ پرکار سے باخبر کون ہے
شیشہ و سنگ میں عہد و پیماں ہیں کیا
سنگ زن کون ہے، شیشہ گر کون ہے

سوچتا ہوں تو چپ چاپ روتا ہوں میں
خود فریبی نے پہنچا دیا ہے کہاں
کعبۂ فکر ہیں صرف لفظوں کے بُت
آنکھ اُوجھل، معانی کی پہنائیاں
گَرد کی طرح بکھرا ہوا فرد فرد
بادلوں کی طرح بے جہت کارواں

خواب میں طے ہوا زندگی کا سفر
خواب ہی میں جلے منزلوں کے چراغ
خواب ہی میں ہوا وہمِ تعبیرِ خواب
خواب ہی میں فروزاں ہوئے دل کے داغ
خواب در خواب، بے خوابیِ چشمِ وا
خواب ٹوٹے تو ہاتھ آئے اپنا سراغ

آج وا ہو گئے زخمِ لب تو کھلا
سینہ در سینہ ہر زخم ناسور تھا
بادۂ ناب کا تو فقط نام تھا
ہر بدن نشۂ زہر سے چور تھا
قرب کے ہر تصور میں تھے فاصلے
آدمی آدمی سے بہت دور تھا

اب کہ دامانِ یوسف کے ہر چاک سے
آئینہ ہو گیا ہر فریبِ کہن
ضربتِ تیشہ کی زد پہ ہے بے ستوں
روبرو آگئے خسرو و کوہکن
'بوذری' اپنی منزل ہے یا زرگری
فیصلہ چاہتی ہے زمینِ وطن

○ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کے دوران صوبائی اسمبلی میں 'سندھی زبان' کو صوبہ سندھ کی 'سرکاری زبان' بنانے کا بل پاس کیا گیا جس کی بنا پر روزنامہ 'جنگ' میں رئیس امروہوی کی ایک نظم شائع ہوئی

'اُردو' کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے

کراچی میں لسانی فسادات اسی 'دھوم' کا نتیجہ تھے۔ (شاعر)

چاند۔۔۔خورشید کا رازداں

(تحریکِ پاکستان کی روشنی میں)

میں اندھیرے میں تھا
دور، گردوں پہ بکھری ہوئی کہکشاں
روشنی کے صحیفے کی تفسیر
نور کی آیتیں
تیرگی میں چمکتا ہوا حرف حرف
مجھ کو سورج کا پیغام دیتا رہا
اور میں شب نورد
صبح کی آس میں
سالہا سال چلتا رہا
اِک چراغ سرِ رہگزر کی طرح
تند موجِ ہوا میں بھی جلتا رہا

میں اندھیرے میں تھا
دور، گردوں میں بکھری ہوئی کہکشاں
دھیرے دھیرے سمٹنے لگی
روشنی کے صحیفے کی تکریم کے نام پر
حسن تنظیم و آداب تقویم کے نام پر
منتشر کہکشاں
اپنے خورشید کی منتظر کہکشاں
دھیرے دھیرے سمٹنے لگی
اور جب ہر طرف سے اندھیرے کی یورش بڑھی
کہکشاں، نور کی ڈھال میں ڈھل گئی
چاند میں ڈھل گئی

چاند، خورشید کا رازداں
چاند، خورشید کا ترجماں
اور خورشید، اِس چاند کے روپ میں
میرے خوابوں کے تاریک اُفق پر چمکنے لگا
میرے خوابوں کے تاریک اُفق پر چمکتا رہا

میں اندھیرے میں تھا
چاند اُبھرا تو بادل اُمڈنے لگے
بادلوں اور ستاروں کی سرگوشیاں۔۔۔
چاند کے گرد اِک جال بننے لگیں
ایک ہالہ بنا
اور چاند اپنی ہی روشنی کے حصاروں میں گھرنے لگا
دائرہ تنگ ہونے لگا
دائرہ تنگ سے تنگ تر ہو گیا
اور چاند اپنی ہی روشنی کی چکاچوند میں کھو گیا
روشنی کے صحیفے کی تفسیر
نور کی آیتیں
تیرگی میں چمکتا ہوا حرف حرف
منتشر ہو گیا
اور میں، شب نورد
میں، چراغ سر رہگزر
دور، تیرہ فضاؤں میں اب
صرف اِک چاند سا مقبرہ دیکھتا ہوں

وفاداری بہ شرطِ استواری

اے صبحِ وطن ہم ترے سورج کی لگن میں
جلتے رہے شب بھر مہ و انجم کی طرح چپ
سہتے رہے ہر ضربتِ سنگِ غمِ ایّام
اشکِ سرِمژگاں کے تلاطم کی طرح چپ
کہتے رہے افسانۂ دل بادِ صبا سے
غنچوں کے دہن بستہ تکلم کی طرح چپ
تکتے رہے حسرت سے ہر اِک ابرِ رواں کو
پھولوں کے خزاں دیدہ تبسم کی طرح چپ

آدابِ غمِ عشق کا احساس کیا ہے
ہر حال میں اِس دل نے ترا پاس کیا ہے

اے صبحِ وطن تو نے ہم آشفتہ سروں کو
گل ریز بھی دیکھا ہے، شرر بار بھی دیکھا
فرہاد کے مانند کبھی تیشہ بکف بھی
مجنوں کی طرح خاکِ رہِ یار بھی دیکھا
سقراط کے مانند کبھی زہر بہ ساغر
عیسیٰ کی طرح ہم کو سرِ دار بھی دیکھا
منصور کے مانند کبھی کشتۂ حق بھی
ناکردہ گناہی کا سزاوار بھی دیکھا

تکریم کی ہر دور میں پندار جنوں کی
توہین نہ ہونے دی کبھی سوزِ دروں کی

اے صبح وطن اب بھی ہے یہ عہد ہمارا
ہم عہد وفا، خون سے تحریر کریں گے

وہ خواب کہ جو تشنۂ تعبیر ہے اب تک
اُس خواب کو شرمندۂ تعبیر کریں گے
جو دشتِ تخیل میں ہے آوارۂ منزل
اُس آہوئے رم خوردہ کو زنجیر کریں گے
یہ شعلۂ مثبت جو فروزاں ہے تو اِک دن
ہر ذرّے کو خورشید کی تصویر کریں گے

اے صبح وطن ہم ترے سورج کی لگن میں
تاحدِ نظر پھول کھلا دیں گے چمن میں

بادل

(پاکستان میں ایک طوفانی بارش کے بعد)

دھرتی اپنا خون جلا کر تجھ کو امر بنائے
موجِ ہوا شانوں پہ اُٹھا کر جگ جگ تجھے اُڑائے

تو مچلے تو چاندنی تجھ سے آنکھ مچولی کھیلے
تو روئے تو دھرتی تیرے آنسو خود پی جائے

تجھ کو اُڑتا دیکھ کے ہر دل اُڑنے کو پر تولے
روح میں ٹھنڈک پھیلتی جائے تیرے سائے سائے

دھوپ میں جلتی دھرتی تجھ کو سر کا آنچل سمجھے
تجھ کو خدا کی رحمت کہہ کر تیرا مان بڑھائے

ڈالی ڈالی ہاتھ اُٹھا کر، رب سے دعائیں مانگے
تو سورج کے تخت پہ بیٹھا، اونچا اُڑتا جائے

O

دھرتی تو اے بادل تجھ سے اتنا پیار جتائے
اور تو اپنی فلک نشینی پر کیا کیا اِترائے

قریہ و شہر ڈبوتا جائے ساگر کی سازش سے
سورج سے انگارے لے کر دھرتی پر برسائے

کہساروں کے تاج اُتارے، پتھر پر دے مارے
دریاؤں کا زہر نکالے، کھیتوں میں پھیلائے

تیز ہوا کے شہپر لے کر دشت و جبل پر دوڑے
اِک خونخوار درندہ بن کر شہروں پر غرائے

تیری بلندی ہی غماز ہے تیرے ہلکے پن کی
دھرتی تجھ سے دہائی مانگے، اور تو ہنستا جائے

O

اے بادل کم ظرف، ترا یہ وار نہ خالی جائے
ہم بھی ہیں دھرتی کے بیٹے، اور کوئی انیّائے

ہم بھی سینہ سپر ہیں ، دیکھیں، تجھ میں کتنا دم ہے
جسموں کی دیوار کھڑی ہے اپنے پاؤں جمائے

ہم اپنی دھرتی کی خاطر، ساگر کو پی جائیں
یہ سیلاب چٹانوں سے ٹکراتا ہے، ٹکرائے

روز ازل سے جاری ہے فطرت سے ہماری جنگ
اُس کو ہر ہر گام پچھاڑیں، جو بھی مقابل آئے

کل اِن کھیتوں کھلیانوں پر کاہکشاں اُترے گی
اوجِ فلک پر رشک کریں گے، دھرتی کے ہمسائے

شاہ بھٹائی

اے بادِ صبا تیرا مہکتا ہوا دامن
اِک شاعرِ درویش کے نغموں کا امیں ہے
ہے تیری ہر اِک موج میں وہ خاکِ کفِ پا
جس خاک سے روشن مرے گردوں کی جبیں ہے
تو نے اُسے دیکھا ہے اُسے پیار کیا ہے
وہ شخص کہ جو سندھ کے ہر دل میں مکیں ہے

اے چاند تری چھاؤں میں سوئی ہیں وہ آنکھیں
جو آنکھ تھی خورشید جمالوں کا نشیمن

اُس ذہن سے پائی تری کرنوں نے تب و تاب
جو ذہن تھا پرنور خیالوں کا نشیمن
اُس دل سے عبارت ہے ترا حسن جہانگیر
جو دل تھا محبت کے اُجالوں کا نشیمن

اے وادیٔ مہران، یہ اعزاز مبارک
سویا ہے تری گود میں وہ شاعرِ بینا
وہ جس کا ہر اِک نغمہ تھا اِک نغمۂ فردوس
وہ جس کا ہر اِک شعر تھا اِک حسن کی دنیا
وہ جس کا ہر افسانہ تھا اِک زندہ حقیقت
وہ جس کا ہر اِک لفظ تھا، آئینۂ فردا

اے شاہ، اجازت ہو تو یہ خاک اُٹھا لوں
اِس خاک کو چوموں، اِسے آنکھوں سے لگا لوں

○ سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی

بابائے اُردو

وہ اِک چراغ کہ روشن ہے انجمن کے لیے
وہ اِک دماغ کہ مشعل ہے اہلِ فن کے لیے
وہ جل رہا ہے کہ اوروں کو روشنی مل جائے

دلوں کی آگ، نگاہوں کا نور زندہ رہے
خیال و خواب کی راہوں کا نور زندہ رہے
لبوں پہ حرفِ تمنا کے پھول ہنستے رہیں
جہانِ دل کے یہ ننھے رسول ہنستے رہیں
مگر یہ غم کہ دلوں کو زباں نصیب نہیں
خیال و خواب کو حسنِ بیاں نصیب نہیں

لبوں پہ کاغذی پھولوں کی مسکراہٹ ہے
نظر میں جھوٹے نگینوں کی جگمگاہٹ ہے
سکوتِ درد کو اذنِ فغاں نصیب نہیں
یہ وہ زمیں ہے جسے آسماں نصیب نہیں
میں سوچتا ہوں کہ وہ ہے چراغِ آخر شب
اور اِس کی بزم کا ہر نغمہ گر ہے مہر بہ لب
نہ جانے وقت کی تقدیر میں لکھا کیا ہے
چراغِ آخرِ شب کی حیات کا کیا ہے
خدا کرے کہ اُسے میری زندگی مل جائے

○ پاکستان کے دستور کے مطابق 'اردو' ہماری قومی زبان ہے۔ مگر آج تک وہ نہ سرکاری زبان بنائی گئی نہ تعلیمی۔ (شاعر)

ماجد، میرا دوست

اپنے ہاتھوں کیسے اپنے ماجد کو مرحوم لکھوں
کیسے ایک دھڑکتے دل کو دھڑکن سے محروم لکھوں
جب بھی سوچوں، دل بھر آئے، آنکھوں میں وہ پھر پھر جائے؟
ایسے زندہ شخص کو کیسے اِک نقشِ موہوم لکھوں
اپنے ہاتھوں کیسے اپنے ماجد کو مرحوم لکھوں

ماجد وہ فنکار تھا جس پر مجھ کو بھی تھا ناز بہت
دل میں اُتر کر رہ جاتا تھا، اُس کا ہر انداز بہت
ہنستا چہرہ، دلکش باتیں، جھوٹا غصہ، سچا پیار
ایسا دوست کہاں سے لاؤں، ویسے دوست نواز بہت
ماجد وہ فنکار تھا جس پر مجھ کو بھی تھا ناز بہت

سوچ رہا ہوں، اچھے لوگوں سے فطرت کو بیر ہے کیوں
عرصۂ خیر و شر میں آخر، راندۂ ہستی خیر ہے کیوں
فنکاروں کے خونِ جگر سے ہوتی ہے تخلیق جمال
پھر اِن فنکاروں کو جہاں میں، کم کم اذنِ سیر ہے کیوں
سوچ رہا ہوں، اچھے لوگوں سے فطرت کو بیر ہے کیوں

فطرت کا اندازِ رقابت، فطرت کا غماز بھی ہے
تخلیقِ آواز میں پنہاں، رازِ شکست ساز بھی ہے
شمع بجھا کر موجِ ہوا، لہرا کے گزر تو جاتی ہے
موجِ ہوا کیا جانے، فطرت آپ سپر انداز بھی ہے
فطرت کا اندازِ رقابت، فطرت کا غماز بھی ہے

ماجد جل کر بجھ تو گیا ہے، شعلۂ مستعجل کی طرح
اُس کی صورت ہے نظروں میں، حسنِ مہِ کامل کی طرح
اُس کا فن، اُس کی تحریریں، اُس کا ہر اندازِ بیاں
وقت کے سینے میں ہے فروزاں، شمع سوز دل کی طرح
ماجد جل کر بجھ تو گیا ہے، شعلۂ مستعجل کی طرح

اے دل رولے، یا چپ ہولے، اور کرے گا بھی تو کیا
اُس کے غم کے آگے تیری آہیں کیا ہیں، آنسو کیا
یہ وہ غم ہے جس کے لیے الفاظ کا دامن بھی ہے تنگ
اِن لفظوں سے نکلیں گے، تسکین دل کے پہلو کیا
اے دل رولے، یا چپ ہولے، اور کرے گا بھی تو کیا

○ عبدالماجد۔ ریڈیو پاکستان کراچی کا ایک ہم عصر اور بڑا صدا کار (ایک اسٹاف آرٹسٹ) شاعر

ٹھہرا ہوا لمحہ

آج بھی گرچہ غمِ دہر کا عالم ہے وہی
دلِ سوزاں ہے وہی، دیدۂ پرنم ہے وہی
روح میں گھلتے ہوئے زہر کا عالم ہے وہی

فکر چپ چپ ہے، پریشان نہیں ہے لیکن
ذہن پر بار نہیں، آج کا ڈھلتا ہوا دن
شام خاموش ہے، ویران نہیں ہے لیکن

وقت نے کس لیے بے وجہ عنایت کی ہے
میرے ہونٹوں کو تبسم کی اجازت دی ہے
ایک ناگفتہ تمنا کی حمایت کی ہے

دل کا اصرار بہت دور نکل جاؤں کہیں
کوئی وادیء سمن پوش ہو اور میری جبیں
کسی گل میں نہ سہی، خار میں ڈھل جاؤں کہیں

لاکھ پہرے ہوں مگر دل پہ کوئی قید نہیں
اِس چمن میں کوئی صیاد نہیں صید نہیں
زندگی کی اِسی منزل پہ کوئی قید نہیں

میں کہاں اور کوئی بار گہہِ ناز، کہاں
رہ گئی چیختی ماحول کی زنجیرِ گراں
لے کے آئی مجھے تخئیل کی پرواز، کہاں

ایسا عالم ہے کہ نظروں میں سماتا ہی نہیں
اور حدِ نگہِ شوق سے جاتا بھی نہیں
اتنی روشن ہے نظر، کچھ نظر آتا ہی نہیں

میرا احساس دروں ہے کہ فضا ہے مخمور
ذرہ ذرہ متبسم ہے ہر اِک شے مسرور
نشہ و کیف سے ہو جیسے یہ دنیا معمور

جانے کس قاف کی وادی میں نکل آیا ہوں
پاؤں دھرتی پہ ہیں اور آپ اُڑا جاتا ہوں
ہر نظر مجھ پہ ہے، کس کس کا میں سرمایہ ہوں

سبزہ تکتا ہے، اُٹھائے ہوئے بھیگی پلکیں
ندیاں ہیں کہ بچھائے ہوئے رہ میں آنکھیں
اور گھٹائیں کہ مئے ناب کے ساغر چھلکیں

شبنم اُٹھ کر میرے پیروں سے چمٹ جاتی ہے
ایک اِک چیز قدم بوسی کو بڑھ آتی ہے
باہیں پھیلا کے ہوا مجھ سے لپٹ جاتی ہے

کس طرف جاؤں ، ہر اِک سمت، بلاتی ہے مجھے
ہر طرف زیست، نیا رنگ دکھاتی ہے مجھے
اور مری فکر، کہ اِک شمع جلے، ایک بجھے

میں ہی کچھ کھویا ہوا ہوں کہ فضا گم سم ہے
جانے کس خواب حسیں میں مری دنیا گم ہے
دل کی دھڑکن ہے، دھڑکنے کی صدا گم سم ہے

کس کی آمد ہے، جو یوں موجِ ہوا رقص میں ہے
لہریئے بنتے ہیں، زنجیر کے حلقے جیسے
اور مرا دل ہے کہ زنجیر بہ پا رقص میں ہے

یک بہ یک تیز ہوا، رقصِ مئے جامِ خیال
اور پھر آپ اُلجھ سا گیا تخئیل کا جال
اور پھر ٹوٹ گیا، دائرۂ دامِ خیال

پھر اندھیرا ہے وہی، دہر کا عالم ہے وہی
دلِ سوزاں ہے وہی، دیدۂ پُرنم ہے وہی
روح میں گھلتے ہوئے زہر کا عالم ہے وہی

تشنگی کا سفر

ایک چھنا کا سا ہوا
وقت یوں ٹوٹ کے بکھرا کہ اُفق تا بہ اُفق
کہکشاں پھیل گئی
ہر ستارہ مرا آئینہ ہوا
اور ہر آئینہ گزرے ہوئے لمحات کی تصویر بنا

ایک لمحہ
وہ سیہ رات میں اِک روزنِ در
اور اُس روزنِ در میں کوئی دزدیدہ نگہ
اور دزدیدہ نگاہوں میں وہ اُجلا پیکر
چاندنی جیسے مجسم ہو جائے

ایک لمحہ
وہ سیہ آنکھوں میں اِک نور کی لہر
اور اُس لہر میں اِک پیاس، سمندر کی طلب
اور اُس پیاس کی ناگفتہ تمناؤں میں خاموش سا مہر
کاش دل، آنکھ کا محرم ہو جائے

ایک لمحہ
وہ تعارف، وہ ملاقات، وہ اِک بات جو افسانہ بنی
دل نے آنکھوں کی سنی، آنکھوں نے دل پہچانا
حجلۂ خواب کی ہر شب، شبِ پیمانہ بنی
ایک حسرت کہ وصالِ گل و شبنم ہو جائے

ایک لمحہ
وہ سفر، منزل نایافت کا بے نام سفر
حسرتِ قرب مگر فاصلۂ جسم کے ساتھ
روح سرشار بہ صد تشنگیٔ قلب و نظر
سائے میں سایہ کچھ اِس طرح سے مدغم ہو جائے

ایک لمحہ

وہ تمناؤں کے صحرا کے بگولے، وہ سراب
حسرتِ لمس میں بیدار لہو کی گردش
ٹوٹتے تاروں کی چھاؤں میں سلگتی ہوئی تنہائی کا خاموش عذاب
آرزو، آگ یہ کم ہو جائے

ایک لمحہ

وہ مہ و سال کے فرسنگ میں اِک سایۂ ابرِ گزراں
سایۂ ابر میں سمٹے ہوئے دل محوِ سفر
لرزشِ لب میں چٹکتے ہوئے غنچوں کا سماں
کاش ابرِ گزراں، ابرِ کرم ہو جائے

ایک لمحہ

وہ نیا نام، نئے عہد کا پیمان نیا
دور رہ کر بھی سدا قرب، سدا پیار کے خواب
روح کے روح میں کھو جانے کا امکان نیا
جسم یوں جسم میں ضم ہو جائے

آج ہر لمحہ مرے خواب میں بیدار ہوا
مجھ سے ہر قرضِ گزشتہ کا طلب گار ہوا
دل سے دل برسرِ پیکار ہوا
اِک چھنا کا سا ہوا
وقت یوں ٹوٹ کے بکھرا کہ اُفق تا بہ اُفق
کہکشاں پھیل گئی
ہر ستارہ مرا آئینہ ہوا
اور ہر آئینہ گزرے ہوئے لمحات کی تصویر بنا
میری تقدیر بنا

میری تقدیر کہ پتھر وہ پگھلتا ہی نہیں
میرا آئینہ مرے عکس میں ڈھلتا ہی نہیں

اَن کہی

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو بھلا کیا معلوم

تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میری تخئیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تری آنکھیں، ترے عارض، ترے ہونٹ
کیسی اَن جانی سی، معصوم خطا کرتے ہیں

تیرے قامت کا لچکتا ہوا مغرور تناؤ
جیسے پھولوں سے لدی شاخ ہوا میں لہرائے
وہ چھلکتے ہوئے ساغر سی جوانی، وہ بدن
جیسے شعلہ سا نگاہوں میں لپک کر رہ جائے

خلوتِ بزم ہو یا جلوتِ تنہائی ہو
تیرا پیکر مری نظروں میں اُبھر آتا ہے
کوئی ساعت ہو، کوئی فکر ہو، کوئی ماحول
مجھ کو ہر سمت، ترا حسن نظر آتا ہے

چلتے چلتے جو قدم آپ ٹھٹک جاتے ہیں
سوچتا ہوں کہ کہیں تو نے پکارا تو نہیں
گم سی ہو جاتی ہیں نظریں تو خیال آتا ہے
اِس میں پنہاں تری آنکھوں کا اشارہ تو نہیں

دھوپ میں سایہ بھی ہوتا ہے گریزاں جس دم
تیری زلفیں مرے شانوں پہ بکھر جاتی ہیں
تھک کے جب سر کسی پتھر پہ ٹکا دیتا ہوں
تیری باہیں مری گردن میں اُتر جاتی ہیں

آنکھ لگتی ہے تو دل کو یہ گماں ہوتا ہے
سرِ بالیں کوئی بیٹھا ہے بڑے پیار کے ساتھ

میرے بکھرے ہوئے اُلجھے ہوئے بالوں میں کوئی
انگلیاں پھیرتا جاتا ہے بڑے پیار کے ساتھ

جانے کیوں تجھ سے دلِ زار کو اتنی ہے لگن
کیسی کیسی نہ تمناؤں کی تمہید ہے تُو
دن میں تو اِک شب مہتاب ہے میری خاطر
سرد راتوں میں مرے واسطے خورشید ہے تُو

اپنی دیوانگیء شوق پہ ہنستا بھی ہوں میں
اور پھر اپنے خیالات میں کھو جاتا ہوں
تجھ کو اپنانے کی ہمت ہے نہ کھو دینے کا ظرف
کبھی ہنستے کبھی روتے ہوئے سو جاتا ہوں

کس کو معلوم مرے خوابوں کی تعبیر ہے کیا
کون جانے کہ مرے غم کی حقیقت کیا ہے
میں سمجھ لوں بھی اگر اِس کو محبت کا جنوں
تجھ کو اِس عشقِ جنوں خیز سے نسبت کیا ہے

تجھ کو معلوم نہیں، تجھ کو نہ ہو گا معلوم

تیرے چہرے کے یہ سادہ سے اچھوتے سے نقوش
میری تخئیل کو کیا رنگ عطا کرتے ہیں
تیری زلفیں، تیری آنکھیں، ترے عارض، ترے ہونٹ
کیسی اَن جانی سی، معصوم خطا کرتے ہیں

پَرتَو

جب بھی دیکھا ہے اُسے دل نے یہ محسوس کیا
جیسے میرے سحر و شام کا محور ہے یہی
میری تخئیل کے آزر نے تراشا ہے جسے
میرے خوابوں کا وہ بے نام سا پیکر ہے یہی

کوئی خلوت ہو کہ جلوت، وہ کسی بزم میں ہو
مجھ کو ہر رنگ میں دلدار نظر آئی ہے
کوئی عالم ہو، کوئی حال ہو میرا، لیکن
وہ مجھے میری طلب گار نظر آئی ہے

اُس کی آنکھوں کی وہ معصوم سی دزدیدہ چمک
کتنے ناگفتہ فسانوں کی ہے تمہید نہ پوچھ
اُس کے گل رنگ لبوں کا وہ تبسم وہ حجاب
کس تمنا کی ہے، بے ساختہ تائید نہ پوچھ

اُس کے اندازِ تکلم کی وہ محتاط روش
کس نوازش کی ہے غماز، کوئی کیا جانے
پاس رہ کر بھی، وہ کچھ دور ہی رہنے کی ادا
کس رفاقت کا ہے آغاز، کوئی کیا جانے

اتنا مانوس ہے اُس کا ہر اِک انداز کہ دل
اُس کی ہر بات کا افسانہ بنا لیتا ہے
اُس کے ترشے ہوئے پیکر سے چرا کر کچھ رنگ
اپنے خوابوں کا صنم خانہ سجا لیتا ہے

جانے اِس حسنِ تصور کی حقیقت کیا ہے
جانے اِن خوابوں کی قسمت میں سحر ہے کہ نہیں

جانے وہ کون ہے، میں نے اُسے سمجھا کیا ہے
جانے اُس کو بھی مرے دل کی خبر ہے کہ نہیں

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ حسنِ دلدار
میری تخئیل کے پَرتَو کے سوا کچھ بھی نہ ہو
اضطراب اور سکوں کی یہ کشاکش یہ ستیز
خود فریبی کی تگ و دَو کے سوا کچھ بھی نہ ہو

تذبذب

دیدۂ نم، دلِ آغشتہ بخوں کی توہین
شکوۂ غم، تپشِ جذبِ دروں کی توہین
دامنِ چاک، شعورِ غم دل کی تحقیر
پاسِ اِدراک، تقاضائے جنوں کی توہین

دل کو آزادِ رسومات کروں یا نہ کروں

آج وہ کیفیتِ غم ہے کہ جی جانتا ہے
دل میں سوزاں وہ جہنم ہے کہ جی جانتا ہے
گرچہ آئینہ در آئینہ ہے ہر سُو رخِ دوست
ایسا تنہائی کا عالم ہے کہ جی جانتا ہے

نذر اشکوں کی یہ سوغات کروں یا نہ کروں

کیسی گمبھیر اُداسی ہے فضا پر طاری
کتنی سنسان نظر آتی ہے دنیا ساری
ذہن ساکت، نظر آوارہ، سخن بے مفہوم
کس کو معلوم یہ لمحات ہیں کتنے بھاری

تجھ سے منسوب یہ لمحات کروں یا نہ کروں

اب کہ یہ دہر، بجز حدِ نظر، کچھ بھی نہیں
اب کہ یہ زیست، بجز دردِ جگر، کچھ بھی نہیں
اب کہ ہر صبح ہے اِک شعلۂ بے دوٗد کا نام
اب کہ ہر شام، بجز دیدۂ تر، کچھ بھی نہیں

اب بھی میں دل کی مدارات کروں یا نہ کروں

○ یہ نظم پہلی بار 'سکوت مضطرب' کے عنوان سے ماہنامہ 'مشرب' کراچی میں شائع ہوئی تھی (شاعر)

بہروپ

اِک مدت سے اِک عہد وفا
سینے سے لگائے پھرتا ہوں
اِک مدت سے اِک دولتِ غم
دنیا سے چھپائے پھرتا ہوں

مری آنکھوں میں کوئی اشک تو کیا
اِک آہِ زیر لب بھی نہیں
کوئی خلوت ہو کوئی جلوت ہو
مرا دل ہے کہیں اور میں ہوں کہیں

ہنستا ہوں کہ ویراں آنکھوں سے
کوئی راز نہ افشا ہو جائے
گاتا ہوں کہ چپ چپ رہنے سے
غمِ عشق نہ رسوا ہو جائے

دل چیختا رہتا ہے لیکن
میں ہنستا ہنساتا رہتا ہوں
اِک مٹی کے مادھو کی طرح
دنیا سے نبھاتا رہتا ہوں

خلاء

خود فریبی کا اِک بہانہ تھا
آج اُس کا فسوں بھی ٹوٹ گیا
آج کوئی نہیں ہے دور و قریب
آج ہر ایک ساتھ چھوٹ گیا
چند آنسو تھے بہہ گئے وہ بھی
دل میں اِک آبلہ تھا پھوٹ گیا

اب کوئی صبح ہے نہ کوئی شام
روشنی ہے نہ تیرگی ہے کہیں
اُس کا غم تھا تو کتنے غم تھے عزیز
وہ نہیں ہے تو آسماں نہ زمیں
ہر طرف ایک ہُو کا عالم ہے
سوچتا ہوں کہ میں بھی ہوں کہ نہیں

کلفٹن

کلفٹن، یہ شہرِ کراچی کا ساحل
یہ عشرت گہہِ وحشتِ دیدہ و دل
ہواؤں میں کیفیتِ بادہ پنہاں
فضا میں جمالِ رُخِ سادہ پنہاں
ہر اِک موج جیسے کوئی زلف پرخم
سنکتی ہواؤں میں کھل جائے اِک دم

تھکا ہارا آہستہ رفتار سورج
یہ خود سوز سورج، خود آزار سورج
سمندر سے اِک پل کو کیا مل گیا ہے
سمندر کا دل پھول سا کھل گیا ہے

ذرا دور اِک سمت، گم سم چٹانیں
سناتی ہوئی اَن کہی داستانیں
کنارے پہ چپ چاپ نظریں جمائے
خدا جانے کیا آس دل سے لگائے
ہزاروں برس سے یونہی ہر گھڑی ہیں
سمندر کے طوفاں کی زد میں کھڑی ہیں

بہت دور جا کر کوئی رازِ پنہاں
سمندر سے کہتا ہوا چرخِ گرداں
بہ احساسِ پستی جو کچھ جھک گیا ہے
بہ پاسِ ادب، بحر بھی رُک گیا ہے

یہ منظر، یہ حسنِ نظر کا فسانہ
یہ دنیا، یہ فطرت کا آئینہ خانہ
یہاں کون کس کے لیے نوحہ گر ہے
کسی تودۂ ریگ کو کیا خبر ہے

متوسط طبقہ

یہ زلفِ پریشاں بھی، بڑی چیز ہے ہمدم
اِس زیست کے صحرا میں جہاں ریت ہے، لُو ہے
جس سمت نظر کیجیے، اِک عالمِ ہُو ہے
اِک سائے کا امکاں بھی، بڑی چیز ہے ہمدم

یہ عارض و لب جن میں کوئی رنگ نہیں ہے
کس کو خبر اِن عارض و لب میں ہے نہاں کیا
کیا جانے کوئی کیفیتِ قلبِ تپاں کیا
وہ قلب جو آسُودۂ آہنگ نہیں ہے

ہم اپنے مقدر کے تراشے ہوئے پتھر
عشرت کدۂ دہر کے دیوار و در و بام
رقصِ مئے گلفام ہو یا گردشِ ایام
ہے اپنی نظر میں تو سدا ایک ہی منظر

دنیا یونہی چلتی ہے، یونہی چلتی رہے گی
ہر صبح کے بعد آئے گی اِک شامِ کشاکش
کیا سوچیے کیا ہو گا اب انجامِ کشاکش
اللہ کی مخلوق، یونہی پلتی رہے گی

آ۔آج کی شب دوٗر، کہیں دوٗر نکل جائیں
کل پھر وہی دن ہو گا، وہی دن کی تمازت
کل پھر وہی ہم ہوں گے، وہی اپنی مشقت
آ۔ رات کی آغوش میں چپ چاپ پگھل جائیں

بازگشت

عجیب رات ہے، پُرنور، پُرسکوں، خاموش

فلک پہ چاند ہے تنہا، قریب و دور کہیں
کوئی ستارہ نہیں، کوئی ابرپارہ نہیں
نظر سے حدِ نظر تک، اُفق سے تا بہ اُفق
ہر ایک کنج منوّر، ہر ایک گوشہ حسیں
کچھ اِس طرح نکھر آیا ہے حسنِ ارض و سما
کہ ایک سے نظر آتے ہیں آسمان و زمیں

ہر ایک ذرّہ ہے خود اپنے نشے میں مدہوش
عجیب رات ہے، پُرنور، پُرسکوں، خاموش

یہی تو رات تھی، جب ہم ملے تھے پہلے پہل

سکوتِ دل میں نہاں تھے، ہزار ہا طوفاں
نظر نظر سے عیاں تھا، حجابِ کیفِ نہاں
لرزتے ہونٹ تھے، چپ چاپ محوِ ناز و نیاز
نفس کی آنچ میں پگھلے ہوئے تھے جسم و جاں
نہ فکرِ دوش نہ اندیشۂ غمِ فردا
نشاطِ قرب نے پہنچا دیا تھا جانے کہاں

عجیب طرح کے یہ سلسلے تھے پہلے پہل
یہی تو رات تھی، جب ہم ملے تھے پہلے پہل

وہی ہے رات، وہی چاندنی، وہی ہم تم

چلو کہ پھر اُسی ساعت کا اہتمام کریں
نگاہ و دل کو حریفِ مہِ تمام کریں

خنک فضاؤں کی آغوش میں پگھل جائیں
کبھی تو اپنی جوانی کا احترام کریں
یہ رات پھر کبھی آئے نہ آئے کیا معلوم
تمام عمر اِسی رات میں قیام کریں

ہزار کشتۂ دنیائے غم سہی، ہم تم
وہی ہے رات، وہی چاندنی، وہی ہم تم

غزل

گردش میں زندگی ہے بسر کر رہا ہوں میں
سورج کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہوں میں

دستک ہوا نے دی ہے ذرا غور سے سنو
طوفاں کی آ رہی ہے صدا غور سے سنو

شاخیں اُٹھا کے ہاتھ دعا مانگنے لگیں
سرگوشیاں چمن میں ہیں کیا غور سے سنو

محسوس کر رہا ہوں میں کربِ شکستگی
تم بھی شگفتِ گل کی صدا غور سے سنو

O

گلچیں کو دیکھ لیتی ہے جب کوئی شاخِ گل
دیتی ہے بددعا کہ دعا غور سے سنو

یہ اور بات، خشک ہیں آنکھیں، مگر کہیں
کھل کر برس رہی ہے گھٹا غور سے سنو

شاخوں سے ٹوٹتے پتوں کو دیکھ کر
روتی ہے منہ چھپا کے ہوا غور سے سنو

یہ دشتِ بے کراں، یہ پراسرار خامشی
اور دؤر اِک صدائے دِرا، غور سے سنو

یہ باز گشت، میری صدا کی ہے یا مجھے
آواز دے رہا ہے خدا، غور سے سنو

بڑھتی چلی ہے، ارض و سما میں کشیدگی
کونین میں ہے حشر بپا، غور سے سنو

کب تک زمیں اُٹھائے رہے آسماں کا بوجھ
اب ٹوٹتی ہے رسمِ وفا، غور سے سنو

میں ٹوٹتا ہوں، خیر مجھے ٹوٹنا ہی ہے
دھرتی چیخ رہی ہے ذرا، غور سے سنو

صحرا میں چیختے ہیں بگولے، تو شہر شہر
اِک شور ہے، سکوت فزا، غور سے سنو

شاعر تراشتے تو ہو دل میں خدا کا بت
آوازۂ شکستِ انا، غور سے سنو

O

پیشِ نظر تا دور سلگتا ملبہ ہے
ہاتھ اُٹھا کر دھواں دہائی دیتا ہے

اِک چہرے میں کتنے ادھورے چہرے تھے
بات کھلی جب آئینہ اپنا ٹوٹا ہے

کچی دیواروں پر بھاری چھت رکھ دی
دیکھتے دیکھتے کیسا بھرا گھر بیٹھا ہے

شاخ سے شاخ لپٹ کر روئے، بین کرے
گلدانوں کی خاطر گلشن اُجڑا ہے

شکل بدل کر آئے ہیں پھر لوگ وہی
کل بھی دل دھڑکا تھا، آج بھی دھڑکا ہے

خاک اُڑاتی گلیوں میں بچّوں کا شور
میرے وطن کے مستقبل کا نوحہ ہے

روشنیوں میں آئے تو معلوم ہوا
اپنے تعاقب میں اپنا ہی سایہ ہے

محنت کی ناجائز بیٹی ہے دولت
قسمت کیا ہے، اِس قحبہ کا پردہ ہے

پھر وہ پتھر، سنگِ میل بنا شاعر
وہ پتھر جو اپنی قبر کا کتبہ ہے

O

راہ دشوار ہے، فرشِ گلِ تر ہونے تک
پاؤں کے زخم ہیں آغازِ سفر ہونے تک

یہ الگ بات کہ خاموش ہیں اہلِ زنداں
ورنہ یہ حبس ہے دیوار میں در ہونے تک

ہم نے تاروں سے ہنر سیکھا ہے شب تابی کا
اِک چراغاں سرِ مژگاں ہے سحر ہونے تک

ہائے وہ بیج جو مٹی میں دبا رہتا ہے
کن مراحل سے گزرتا ہے شجر ہونے تک

کیا خبر تم کو کہ یہ سقف یہ دیوار ہے کیا
ہم پہ کیا گزری ہے اِس چھاؤں کے گھر ہونے تک

O

(۱۹۷۲ء میں پاکستان کے ٹوٹنے پر)

یہ بات تو نہیں ہے کہ میں کم سواد تھا
ٹوٹا ہوں اِس بنا پہ کہ میں کج نہاد تھا

الزام اپنی موت کا موسم پہ کیوں دھروں
میرے بدن میں میرے لہو کا فساد تھا

اب میں بھی جل کے راکھ ہوں، میرے جہاز بھی
کل میرا نام، 'طارقِ ابنِ زیاد' تھا

ایماں بھی لاج رکھ نہ سکا میرے جھوٹ کی
اپنے خدا پہ کتنا مجھے اعتماد تھا

گہرے سمندروں میں بھی پتھر ملے مجھے
تھا میں گہر شناس، مگر سنگ زاد تھا

وہ بادباں دریدہ سفینے کا ناخدا
اور قلزمِ سراب کا میں 'سندباد' تھا

اب ہوں زباں بریدہ تو یہ سوچ کر ہوں چپ
یہ بھی سخن شناس کا اندازِ داد تھا

O

کل تک تو اِک فریبِ یقیں تھا، گماں کے ساتھ
اور آج یہ زمیں بھی نہیں آسماں کے ساتھ

ہر ذرہ اپنی حدِ کشش سے نکل گیا
تنہا ہر ایک دل ہے غمِ بیکراں کے ساتھ

ہر نقشِ پا کا آپ ہی بنتی رہی کفن
گردِ سفر جو اُڑتی رہی کارواں کے ساتھ

تم اِس کو جبرِ وقت کہو یا ہوا کا رخ
اِک نسبتِ قفس بھی رہی آشیاں کے ساتھ

تنہا ہے تُو بھی میری طرح اے خدائے کُل
اِک رشتۂ نہاں بھی ہے ہم میں عیاں کے ساتھ

O

(روئے سخن ہے اُس کی طرف جو بھی زد میں ہے)

میں تو سمجھ رہا تھا کہ سورج گہن میں تھا
دیکھا جو روشنی میں تو سایہ بدن میں تھا

آئینے میں کھلا ترا سحرِ کمالِ فن
تیرے ہی دل کا عکس ترے مکر و فن میں تھا

سانپوں کی طرح جسم سے لپٹی ہوں جب رگیں
حیرت ہی کیا جو زہر بھی حرفِ سخن میں تھا

شبنم سے روئے صبح رہا باوضو تو کیا
راتوں کا راز، بسترِ گل کی شکن میں تھا

دیکھا وہ خواب، رات کہ میں چیخ چیخ اُٹھا
میرا خدا بھی حلقۂ دارورسن میں تھا

O

یادوں کے سائبان میں شمعیں جلی ہوئیں
تنہا بھی تھا جو میں تو بھری انجمن میں تھا

وہ دھوپ چاندنی تھی وہ پتھر بھی پھول تھے
کیا جانے سحر کیا مری خاکِ وطن میں تھا

شفاف سطحِ آب پہ کھلتے کنول سے لوگ
یہ زندگی کا روپ بھی ارضِ دکن میں تھا

O

اِس دشتِ سخن میں کوئی کیا پھول کھلائے
چمکی جو ذرا دھوپ تو جلنے لگے 'سائے'

سورج کے اُجالے میں چراغاں نہیں ممکن
سورج کو بجھا دو کہ زمیں جشن منائے

مہتاب کا پَرتَو بھی ستاروں پہ گراں ہے
بیٹھے ہیں شبِ تار سے اُمید لگائے

ہر موجِ ہوا شمع کے درپَے ہے ازل سے
دل سے کہو، لَو اپنی ذرا اور بڑھائے

کس کوچۂ طفلاں میں چلے آئے ہو شاعر
آوازہ کسے ہے تو کوئی سنگ اُٹھائے

O

منزل کے خواب دیکھتے ہیں پاؤں کاٹ کے
کیا سادہ دل یہ لوگ ہیں گھر کے نہ گھاٹ کے

اب اپنے آنسوؤں میں ہیں ڈوبے ہوئے تمام
آئے تھے اپنے خون کا دریا جو پاٹ کے

شہرِ وفا میں حقِ نمک یوں ادا ہوا
مخمل میں ہیں لگے ہوئے پیوند ٹاٹ کے

کھینچی تھی جن کے خوف سے سدّ سکندری
سوئے نہیں ہیں آج وہ دیوار چاٹ کے

اب تو درندگی کی نمائش بھی حسن ہے
دیوار پر سجاتے ہیں سر کاٹ کاٹ کے

O

ٹوٹا نہیں بکھر کے بھی خوابِ جنوں ہنوز
سر چڑھ کے بولتی ہے کوئی موجِ خوں ہنوز

بار گراں ہے پھر بھی اُٹھائے ہوئے ہیں لوگ
اپنے سروں پہ یہ فلکِ واژگوں ہنوز

کوئی دکھائے پھر یدِ بیضا کا معجزہ
طاری ہے سامری کا دلوں پر فسوں ہنوز

پھر جوئے شِیر کا کوئی دینے لگا فریب
مانگے ہے ضربِ تیشہ کوئی بے ستوں ہنوز

دل بھی ہے رہنِ غیر، بدن بھی ہے رہنِ غیر
اپنی کلاہ کج ہے بہ حالِ زبوں ہنوز

نعروں میں گونجتا ہوں تو چپ ہوں کتاب میں
معنی سے بے نیاز، میں اِک لفظ ہوں ہنوز

جو شاخ بے ثمر ہے یہاں، سر بلند ہے
اور شاخِ باردار کا ہے سرنگوں ہنوز

سورج پگھل گیا نہ ہو پہلو میں رات کے
اِس نم فضا میں آتشِ دل ہے فزوں ہنوز

شاعر میں شعر بھی نہ کہوں اب تو کیا کروں
دل تھا جو بے سکون، سو ہے بے سکوں ہنوز

O

آتش کدۂ دل کو ہوا کیوں نہیں دیتے
پتھر تو نہیں لوگ، صدا کیوں نہیں دیتے

سرمست اگر ہو تو سرِ بزم رقیباں
اِک نعرۂ مستانہ، لگا کیوں نہیں دیتے

سایہ ہے کہ خورشید کے دل کی ہے سیاہی
محرم ہو تو یہ راز بتا کیوں نہیں دیتے

سودا ہے اگر سر میں تو ٹکراتے نہیں کیوں
دیوار میں در کوئی بنا کیوں نہیں دیتے

سلجھاتے ہو بے کار یہ پیچیدہ لکیریں
یہ نقش غلط ہے تو مٹا کیوں نہیں دیتے

بیٹھے ہو جو یوں جسم کی قبروں میں سمٹ کر
کتبہ بھی سرِ قبر لگا کیوں نہیں دیتے

صیقل ہے خیالات کا آئینہ تو شاعر
یہ آئینہ دنیا کو دکھا کیوں نہیں دیتے

O

دل پر گراں گزرتا ہے اب تیرا ساتھ بھی
اِک ہتھکڑی سا لگتا ہے، ہاتھوں میں ہاتھ بھی

تپ تپ کے اپنی آگ میں بجھ تو گیا ہے دن
اب قبر کے عذاب میں گزرے گی رات بھی

اِک لمحۂ رواں سے بھی کم ہے سکوتِ مرگ
اِک لفظ سے زیادہ نہیں ہے حیات بھی

اِک خوابِ ناتمام کا عالم نگاہ میں
اِک وہم کا شکار، یقینِ ثبات بھی

اُڑتے ہوئے غبارے سے مہر و مہہ و نجوم
اور ان میں اِک کھلونا ہے انساں کی ذات بھی

اِک دوسرے کی زد میں ہیں مُہرے کچھ اِس طرح
ڈر ہے، اُلٹ نہ جائے کہیں یہ بساط بھی

O

اُٹھنے لگا دھواں، دلِ غم انتساب سے
کجلا نہ جائے اور زمیں آفتاب سے

لفظوں میں گُھٹ نہ جائے معانی کا دم کہیں
لَو دے اُٹھے نہ حرفِ جنوں احتساب سے

زیرِ زمیں درختوں کی بڑھنے لگیں جڑیں
خورشید، اَبر اُٹھانے لگا سطحِ آب سے

تہہ کی خبر تو کیا، انہیں اپنی خبر نہیں
اُبھرے ہیں سطحِ آب پہ سر جو حباب سے

چہروں پہ جو لکھا ہے وہ الفاظ میں کہاں
اِک جھوٹ کا اضافہ ہوا ہے کتاب سے

میرے لہو کی آب میں چہرہ نما بھی ہیں
منظر تری نگاہ میں ہیں جو سراب سے

ہر حجلۂ سکوت میں طوفاں ہے مضطرب
کب تک بندھے رہیں گے یہ خیمے طناب سے

کانوں میں آ رہی ہے کسی صور کی صدا
دھڑکے ہوئے ہیں دل کسی روزِ حساب سے

ہر شخص اپنی فردِ عمل کو سمیٹ کر
آئینہ دیکھتا ہے بڑے اضطراب سے

جسموں پہ پیرہن کی سجاوٹ ہے دیدنی
لیکن عرق عرق سے ہیں چہرے گلاب سے

بیدار دل میں ہے کوئی بے نام خوف سا
سہمی ہوئی ہے روح سوال و جواب سے

سنتے ہیں بازگشت جب اپنی صداؤں کی
رہ رہ کے جاگ پڑتے ہیں کچھ لوگ خواب سے

اُن پر بھی فاش ہو گئے شاید فلک کے راز
سوئے زمیں جو آنے لگے ہیں شہاب سے

O

اہلِ نظر کو دولتِ حسنِ نظر ملی
مجھ کم نظر کو اور ہی کوئی خبر ملی

اِک خواب سا تھا، ٹوٹ گیا، آنکھ کھل گئی
تعبیرِ خواب، خواب سے بھی پیشتر ملی

دیکھا تو آج اپنے مکینوں کی یاد میں
روتی ہوئی خموشیٔ دیوار و در ملی

آنکھوں میں جگمگاتے رہے جنتوں کے خواب
جنت میں پاؤں رکھا تو ہر چشم تر ملی

اِک عمر کی مسافتِ بے نام کے عوض
گر کوئی شے ملی بھی تو گردِ سفر ملی

O

میں سوچتا ہوں مگر میری سوچ ہی کیا ہے
بس ایک خوابِ حقیقت ہے، آگہی کیا ہے

ہر ایک بات زباں پر ہے، گفتنی کے سوا
اِس اختیار پہ یہ جبرِ خامشی کیا ہے

وہ روشنی ہے کہ ہر شے نظر سے اُوجھل ہے
یہ روشنی ہے تو پھر اور تیرگی کیا ہے

وہ مشتِ خاک ہوا نے جسے بکھیر دیا
سمیٹنے کی تگ و دَو ہے آدمی کیا ہے

میں آئینے میں بھی ہوں، آئینے کے باہر بھی
مرے وجود کی وحدت میں یہ دوئی کیا ہے

میں وہ یقیں ہوں، نظر آئے جو گماں کی طرح
تری زمیں پہ ازل سے ہوں آسماں کی طرح

مجھے غروب نہ جانو جو میں اُفق پہ نہیں
بکھر گیا ہوں اندھیرے میں کہکشاں کی طرح

وہ نقش آب ہی اچھا جو ہر نظر میں نہیں
اُبھر کے کون مٹے نقشِ رائگاں کی طرح

O

نظر نظر کا تماشا بنوں تو کیا حاصل
رہوں تو دل میں رہوں یادِ رفتگاں کی طرح

اُس اَبر کو بھی اُڑا لے گئی یہ تیز ہوا
جو میرے سر پہ رہا دستِ مہرباں کی طرح

مری متاعِ سخن ہے تمہارا سرمایہ
اِسے سنبھال کے رکھنا متاعِ جاں کی طرح

O

الفاظ ہیں کہ زہر کے پیالے بھرے ہوئے
یہ مدرسے، یونہی تو نہیں، مقبرے ہوئے

خود آگہی نہ تھی تو خدا آشنا تھے ہم
خود آشنا ہوئے تو ہیں خود سے ڈرے ہوئے

اِک مرکزِ نگاہ پہ کوئی نہ آ سکا
ہر چند ذہن و دل میں بہت مشورے ہوئے

اب کیوں نہ شاخِ دار پہ آئے سروں کی فصل
شہروں کا خوں پیا ہے تو جنگل ہرے ہوئے

اِک جرمِ بے وفائی، بنامِ وفا سہی
الزام یوں بھی سر پہ ہیں کتنے دھرے ہوئے

O

لٹا دیا ہے غمِ آب و تاب میں کیا کیا
وگرنہ خواب تھے چشمِ پُر آب میں کیا کیا

بلندیوں کا بھی اُٹھا ہے پستیوں سے خمیر
زمیں کے راز ہیں اُڑتے سحاب میں کیا کیا

یقیں نہ ہو تو کوئی ڈوب کر ذرا دیکھے
بھنور ہیں سوئے ہوئے نقش آب میں کیا کیا

کوئی تو دیکھے مجھے میری آنکھ سے یا رب
دکھائی دیتا ہے مجھ کو سراب میں کیا کیا

میں لفظ لفظ جو پڑھتا گیا تو بات کھلی
کھنچی ہوئی تھیں لکیریں کتاب میں کیا کیا

فقط سکوں کی طلب ہے بنامِ خلدِ بریں
فریب خود کو دیے اضطراب میں کیا کیا

وہ روشنی تھی کہ کچھ بھی نظر میں نہ آ سکا
سیاہیاں تھیں رُخِ آفتاب میں کیا کیا

ہجومِ رنگ میں خوشبو کی جستجو کے لیے
دیے جلائے ہیں طاقِ گلاب میں کیا کیا

ہر ایک نام تھا حرف غلط، بجز شاعر
کھلا ہے ذوقِ نظر انتخاب میں کیا کیا

O

کیسے کیسے خواب دکھلائیں مہ و اختر مجھے
اپنی گردش سے نہ ہٹنے دے مرا محور مجھے

آئی تھی موجِ ہوا، مجھ کو اُڑانے کے لیے
سر ٹپک کر رہ گئی، دیکھا جو اِک پتھر مجھے

گھر کی دیواروں نے ڈالی ہے بِنائے قید و بند
اب تو زنداں بھی نظر آتا ہے اپنا گھر مجھے

ذہن چنتا جائے مجھ کو جسم کی دیوار میں
اور دل لے جائے، اپنے آپ سے باہر مجھے

میں ہی کچھ بدلا ہوا ہوں یا مرے گھر کی فضا
اجنبی سے لگ رہے ہیں اپنے بام و در مجھے

سلوٹوں کے سانپ لہراتے رہے پھولوں کے بیچ
رات بھر ڈستا رہا مہکا ہوا بستر مجھے

O

اِس عرض سخن کا مجھے یارا تو نہیں تھا
درپردہ ترے غم کا اشارا تو نہیں تھا

دنیا مری دشمن سہی، تو کیوں ہے گریزاں
مشکل میں تجھے میں نے پکارا تو نہیں تھا

روٹی کے لیے طاق پہ رکھ دوں گا کتابیں
جینا مجھے اِس طرح گوارا تو نہیں تھا

کیوں آئینہ دیکھا تو ندامت ہوئی مجھ کو
میں رزم گہہِ زیست میں ہارا تو نہیں تھا

ماں کی طرح پالا ہے زمیں نے مجھے ورنہ
افلاک تلے کوئی سہارا تو نہیں تھا

کرتا میں کسی خال پہ کس طرح نچھاور
یہ ملک 'سمر قند و بخارا' تو نہیں تھا

کیوں کاٹ دیا میرے قلم نے مجھے شاعر
لکھا ہوا میں حرف، دوبارہ تو نہیں تھا

O

اِس دشت پہ احساں نہ کر اے ابرِ رواں اور
جب آگ ہو نم خوردہ تو اُٹھتا ہے دھواں اور

وہ قحطِ جنوں ہے کہ کوئی چاک گریباں
آتا ہے نظر بھی تو گزرتا ہے گماں اور

یہ سنگ زنی میرے لیے بارشِ گل ہے
تھک جاؤ تو کچھ سنگ بدستِ دگراں اور

سورج کو یہ غم ہے کہ سمندر بھی ہے پایاب
یارب مرے قلزم میں کوئی موجِ رواں اور

شاعر یہ زمیں حضرتِ غالب کی زمیں ہے
ہر شعر طلب کرتا ہے خونِ رگِ جاں اور

O

پندارِ زہد ہو کہ غرورِ برہمنی
اِس دورِ بت شکن میں ہے ہر بت شکستنی

صر صر چلے کہ تند بگولوں کا رقص ہو
موجِ نمو رواں ہے تو ہر گُل شگفتنی

گلچین و گلفروش کی خاطر ہے فصلِ گل
اور قسمتِ جنوں ہے فقط چاک دامنی

دیوارِ ابر کھینچئے کرنوں کی راہ میں
ذروں میں قید کیجیے سورج کی روشنی

موجِ نفس سے لرزے ہے تارِ رگِ حیات
پھیلی ہے شہرِ دل میں وہ پرہول سنسنی

کل تک تھا جس پہ ناز وہی شاعرِ غریب
احباب کی نگاہ میں ٹھہرا ہے کشتنی

O

دیکھے جو آبلے کسی رہرو کے پاؤں میں
نادم کھڑے ہوئے ہیں درخت اپنی چھاؤں میں

اب آدمی سے دور یہاں بھی ہے آدمی
شہروں کی وسعتیں سمٹ آئی ہیں گاؤں میں

O

یم بہ یم پھیلا ہوا ہے پیاس کا صحرا یہاں
اِک سرابِ بیکراں ہے ایک اِک قطرہ یہاں

روشنی کے زاویوں پر منحصر ہے، زندگی
آپ کے بس میں نہیں ہے آپ کا سایہ یہاں

آتے آتے آنکھ تک دل کا لہو پانی ہوا
کس قدر ارزاں ہے اپنے خون کا سودا یہاں

تیرے میرے درمیاں حائل ہے اِک دیوارِ حرف
رکھ لیا ہے بات ہی نے بات کا پردہ یہاں

دیکھیے تو یہ جہاں ہے، اِک جہانِ آب و گِل
سوچیے تو ذرہ ذرہ میں ہے اِک دنیا یہاں

O

اپنا اندازِ جنوں سب سے جدا رکھتا ہوں میں
چاکِ دل، چاکِ گریباں سے سوا رکھتا ہوں میں

غزنوی ہوں اور گرفتارِ خمِ زلفِ ایاز
بت شکن ہوں اور دل میں بت کدہ رکھتا ہوں میں

ہے خود اپنی آگ سے ہر پیکرِ گِل، تابناک
لے ہوا کی زد پہ مٹی کا دیا رکھتا ہوں میں

میں کہ اپنی قبر میں بھی زندہ ہوں گھر کی طرح
جسم پر اپنا کفن، احرام سا رکھتا ہوں میں

دشتِ غربت میں ہوں آوارہ، مثالِ گرد باد
کوئی منزل ہے نہ کوئی نقشِ پا رکھتا ہوں میں

میرا سایہ بھی نہیں میرا، اُجالے کے بغیر
اور اُجالے کا تصور خواب سا رکھتا ہوں میں

O

میرا شعور مجھ کو یہ آزار دے گیا
سورج کی طرح دیدۂ بیدار دے گیا

ہر پھول اِک شرر ہے تو ہر شاخ ایک برق
جنت کا خواب، دوزخِ گلزار دے گیا

سورج کا رُخ بدلتے ہی خود بھی بدل گیا
کیسا فریب سایۂ دیوار دے گیا

لب بستگی میں حسرتِ گفتار جاگ اُٹھی
خوفِ سکوت، جرأتِ اظہار دے گیا

جلتا ہوں اپنی آگ میں خورشید کی طرح
کیسی سزا یہ شعلۂ پندار دے گیا

سائے میں آسماں کے بھی مجھ کو نہ مل سکا
وہ آسرا جو سایۂ دیوار دے گیا

O

پڑ جائے راہ میں نہ کہیں خاک دیکھ کر
ملتے ہیں لوگ شہر میں پوشاک دیکھ کر

شاید ہمیں عزیز نہیں اپنی زندگی
لوٹ آئے لوگ، راہ خطر ناک دیکھ کر

O

دل میں تھا جو خیال وہ لکھا نہ جا سکا
جامہ تھا اتنا تنگ کہ پہنا نہ جا سکا

کل رات اتنی تیز تھی آوازِ خامشی
سو مسئلے تھے، ایک بھی سوچا نہ جا سکا

دل کو تھا شب، عجیب سا دھڑکا لگا ہوا
مجھ سے کھلی فضا میں بھی سویا نہ جا سکا

کانوں میں آ رہی تھی صدائے رحیلِ صبح
آنکھوں میں تھی وہ نیند کہ جاگا نہ جا سکا

میں چشم وا کیے اُسے تکتا رہا مگر
وہ نور تھا نظر میں کہ دیکھا نہ جا سکا

لرزاں رہا لبوں پہ کوئی حرفِ آرزو
طاری تھا وہ سکوت کہ بولا نہ جا سکا

اُترا سوادِ ماہ سے وہ اِس ادا کے ساتھ
اُس کو زمینِ شعر پہ لایا نہ جا سکا

O

شاعر صاحب اِس بستی میں کس کو گیت سناتے ہو
سایوں کے سنسان نگر میں کس کا دل گرماتے ہو

سونے چاندی کی دنیا میں پیار کی قیمت کیا ہو گی
دل کا کھوٹا سکہ لے کر کس بازار میں جاتے ہو

جلتا سورج، تپتی دھرتی، اونچی نیچی راہگزر
اپنے سائے سائے چل کر پگ پگ ٹھوکر کھاتے ہو

اُڑتے بگولوں کے پیچھے کیوں دوڑ رہے ہو، رُک جاؤ
اِس آباد خرابے میں کیوں اپنی جان گنواتے ہو

تنہا تنہا، کھوئے کھوئے، چپ چپ رہنے سے حاصل
کونے کونے رو لیتے ہو، دل کی آگ بجھاتے ہو

جن پر تم کو ناز تھا وہ بھی بک گئے دوکوڑی کے مول
اب بھی وقت کا رُخ پہچانو، وقت سے کیوں ٹکراتے ہو

ایسے روشن سورج سے تو رات کے تارے ہی اچھے
ساتھ نہ دے جو اندھیارے میں کیوں اس کے گن گاتے ہو

O

رات سنسان، دشت و در خاموش
چاند تارے شجر حجر خاموش

کوئی آوازِ پا نہ بانگِ جرس
کارواں اور اِس قدر خاموش!

ہر طرف اِک مہیب سناٹا
دل دھڑکتا تو ہے مگر خاموش

ہوئے جاتے ہیں کس لیے آخر
ہم سفر، بات بات پر خاموش

ہیں یہ آدابِ رہگزار کہ خوف
راہرو چپ ہیں، راہبر خاموش

مختصر ہو نہ ہو شبِ تاریک
ہم کو جلنا ہے تا سحر خاموش

ڈھل چکی رات، بجھ گئیں شمعیں
راہ تکتی ہے چشمِ تر خاموش

جانے کیا بات کر رہے تھے کہ ہم
ہو گئے ایک نام پر خاموش

ہم سے شاعر بھی ہو گئے آخر
رنگِ حالات دیکھ کر خاموش

O

آج کی شب جیسے بھی ہو ممکن جاگتے رہنا
کوئی نہیں ہے، جان کا ضامن، جاگتے رہنا

قزاقوں کے دشت میں جب تک قافلہ ٹھہرے
قافلے والو، رات ہو یا دن، جاگتے رہنا

تاریکی میں لپٹی ہوئی پُرہَول خموشی
اِس عالم میں، کیا نہیں ممکن، جاگتے رہنا

آہٹ آہٹ پر جانے کیوں دل دھڑکے ہے
کوئی نہیں اطراف میں لیکن، جاگتے رہنا

ٹھنڈی ہواؤں کا اے دل، احساں نہ اُٹھانا
کوئی یہاں ہمدرد نہ محسن، جاگتے رہنا

راہنما سب دوست ہیں لیکن اے ہم سفرو!
دوست کا کیا ظاہر، کیا باطن، جاگتے رہنا

تاروں کی آنکھیں بھی بوجھل بوجھل سی ہیں
کوئی نہیں اب شاعر تجھ بن جاگتے رہنا

ایک اضافی بحر۔تاک دِھنادِھن (تین بار)

O

راستہ تیرہ و تار ہے، کچھ کہو
ہر قدم اِک گراں بار ہے، کچھ کہو

کوئی نغمہ نہیں، کوئی نالہ نہیں
خامشی مرگ آثار ہے، کچھ کہو

کون مشعل بکف ہے ذرا دیکھ لو
کیوں ہراساں دلِ زار ہے، کچھ کہو

ہر نظر، خار کی طرح چبھتی ہوئی
ہر نفس، تیغ کی دھار ہے، کچھ کہو

برق چمکی، خلاء میں کہیں کھو گئی
روشنی کتنی لاچار ہے، کچھ کہو

سر سراتی ہوا کی ہیں سرگوشیاں
یا کہ ناگن کی پھنکار ہے، کچھ کہو

O

وہ ایک لفظ جو شرمندۂ بیاں نہ ہوا
اُس ایک لفظ کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

اُس ایک اشک سے قائم ہیں آبرو غم کی
جو دل میں ڈوب گیا آنکھ سے رواں نہ ہوا

O

نالۂ غم، شعلہ اثر چاہیے
چاکِ دل اب تا بہ جگر چاہیے

کتنے مہ و نجم ہوئے نذرِ شب
اے غمِ دل، اب تو سحر چاہیے

منزلیں ہیں زیرِ کفِ پا مگر
ایک ذرا عزمِ سفر چاہیے

آئینہ خانے میں ہے درکار کیا
چاہیے اِک سنگ اگر چاہیے

توڑ چکا حدِ تعین جنوں
اب کوئی دیوار نہ در چاہیے

تشنگیٔ لب کا تقاضہ ہے اب
بادہ ہو یا زہر مگر چاہیے

راہ نہیں کوئی بجز راہِ عشق
عشق کا ادراک مگر چاہیے

دور ہے دل منزل غم سے ہنوز
اِک غلط انداز نظر چاہیے

وہ کہ انہیں دل سے غرض ہی نہیں
دل کی یہ ضد اُن کو مگر چاہیے

ق

سہل نہیں پیرویٔ رنگِ میر
سوز دل و دیدۂ تر چاہیے
شاعر اِس اندازِ سخن کے لیے
میرؔ سا عرفانِ ہنر چاہیے

O

رُکتا ہے اُجالا کہیں ظلمت کی سِپر سے
سورج تو در آئے گا ہر اِک روزنِ در سے

کجلائی ہوئی دھوپ ہے یا تپتی ہوئی چھاؤں
یہ راز بھی کھل جائے گا نکلو گے جو گھر سے

اِس دور میں جو شخص ہے دستار بہ سر ہے
ہو کوئی تو، نکلے جو کفن باندھ کے سر سے

یوں دل کی سیاہی میں قلم ڈوب گئے ہیں
تحریر کو نسبت نہ رہی خونِ جگر سے

خود اپنے تعاقب میں ہیں پرچھائیں کے مانند
ہم لوگ جو پوشیدہ ہیں خود اپنی نظر سے

کٹتی ہے تو سایوں میں بدل جاتی ہے ہر رات
شب کا کوئی گہرا ہی تعلق ہے سحر سے

O

کسی طرح یہ شبِ تار، مختصر ہو تو
سحر کے ہم بھی پرستار ہیں، سحر ہو تو

یہ اہتمامِ بہاراں، بجا سہی، لیکن
بہار کی کوئی تدبیر، معتبر ہو تو

ہمیں بھی حسن سے رغبت ہے، زندگی سے لگاؤ
غمِ معاش سے لیکن کبھی مفر ہو تو

اب استعاروں میں ہوتی ہیں راز کی باتیں
یہ خوف ہے کہ کوئی پیش و پس اگر ہو تو

ہمارے چاکِ جگر کی کسے خبر شاعر
کسی کو اپنے سوا، اور کی خبر ہو تو

ہر قدم پر نت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے، کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

کس لیے کیجے کسی گم گشتہ جنت کی تلاش
جب کہ مٹی کے کھلونوں سے بہل جاتے ہیں لوگ

کتنے سادہ دل ہیں اب بھی، سن کے آوازِ جرس
پیش و پس سے بے خبر، گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

O

اپنے سائے سائے سر نہوڑائے، آہستہ خرام
جانے کس منزل کی جانب آج کل جاتے ہیں لوگ

شمع کے مانند اہلِ انجمن سے بے نیاز
اکثر اپنی آگ میں چپ چاپ جل جاتے ہیں لوگ

شاعر اُن کی دوستی کا اب بھی دم بھرتے ہیں آپ
ٹھوکریں کھا کر تو سنتے ہیں سنبھل جاتے ہیں لوگ

O

جب تک زمیں پہ رینگتے سائے رہیں گے ہم
سورج کا بوجھ سر پہ اُٹھائے رہیں گے ہم

کھل کر برس ہی جائیں کہ ٹھنڈی ہو دل کی آگ
کب تک خلا میں پاؤں جمائے رہیں گے ہم

جھانکے گا آئینوں سے کوئی اور جب تلک
ہاتھوں میں سنگ و خشت اُٹھائے رہیں گے ہم

اِک نقشِ پا کی طرح سہی اِس زمین پر
اپنی بھی ایک راہ بنائے رہیں گے ہم

جب تک نہ شاخ شاخ کے سر پر ہو تاجِ گُل
کانٹوں کا تاج سر پہ سجائے رہیں گے ہم

O

آئے تھے تیرے شہر میں کتنی لگن سے ہم
منسوب ہو سکے نہ تری انجمن سے ہم

یوں بے رخی سے پیش نہ آ، اہلِ دل کے ساتھ
اُٹھ کر چلے نہ جائیں تری انجمن سے ہم

یہ سرکشی جنوں نہیں، پندارِ عشق ہے
گزرے ہیں دار سے بھی اِسی بانکپن سے ہم

ملتے ہیں روز دستِ صبا سے پیامِ گُل
زنداں میں بھی قریب ہیں اہلِ چمن سے ہم

اے ریگزارِ سندھ ترا چاند بجھ نہ جائے
آئے ہیں اس کی چاہ میں ارضِ دکن سے ہم

شاعر ادب کے محتسبوں کو خبر نہیں
کیا کام لے رہے ہیں تغزل کے فن سے ہم

O

(ایک 'خود پرست' سیاسی رہنما کے نام)

ہر رہنمائے وقت ہے رہزن، ترے سوا
سچ ہے، ہر ایک دوست ہے، دشمن، ترے سوا

اِک تو کہ ہے جنوں میں بھی پاسِ خرد تجھے
ہر شخص کا دریدہ ہے دامن، ترے سوا

فہرستِ دلبراں میں کوئی معتبر نہیں
لے کس کا نام ، دل کی یہ دھڑکن، ترے سوا

لب تشنگاں کے واسطے ابرِ کرم ہے تو
صحرا ترے سوا ہے نہ گلشن، ترے سوا

تو ہے تو مرغزار ہے یہ ریگزار بھی
ملبے کو نام کون دے خرمن، ترے سوا

دامن کسی کا چاک تو دل ہے کسی کا چاک
کس کو غمِ سلامتیء تن، ترے سوا

بازی گروں میں آج بچھی ہے بساطِ دل
ہر ایک مہرہ باز ہے پُر فن، ترے سوا

منسوب میری موت ہے جب تیرے نام سے
کیوں اور نام ہو سرِ مدفن، ترے سوا

'بعداز خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر'
زیرِ فلک کہیں نہیں مامن، ترے سوا

O

پندارِ یوسفی سہی، پندار ہی تو ہے
بازار کی یہ شے، سرِ بازار ہی تو ہے

بہروپ میں عبث ہے تمہیں روپ کی تلاش
جھوٹی کہانیوں کا وہ کردار ہی تو ہے

وہ آدمی ہی کیا کہ جو ماضی کو بھول جائے
آخر زمانہ، گردشِ پرکار ہی تو ہے

آج اِس کی گود میں ہے تو کل اُس کی گود میں
دولت ہے چیز کیا، زنِ بازار ہی تو ہے

شہرت تو وہ ہے سینہ بہ سینہ جو چل سکے
ناز اس پہ کیا کہ شہرتِ اخبار ہی تو ہے

گر دھوپ سے بچا بھی تو بارش سے دھل گیا
یہ اشتہار، نقش بہ دیوار ہی تو ہے

چہروں کو پوجتا نہیں کوئی خدا پرست
چہرہ پرست، بت کا پرستار ہی تو ہے

ٹوٹے تو کیا کہ دل سے تو نسبت نہیں اُسے
ربطِ دکاندار و خریدار ہی تو ہے

کب تک وفا کے نام پہ جھیلے کوئی عذاب
دل اُس کی دوستی کا گنہگار ہی تو ہے

کب تک رہے گی راہ میں حائل یہ بنتِ خاک
اِک روز ٹوٹ جائے گی، دیوار ہی تو ہے

میں سخت جاں تو مر نہ سکا دشمنوں سے بھی
وہ دوستی میں درپئے آزار ہی تو ہے

میں بھی انا پرست ہوں ۔ اقرار کیا کروں
میرے لبوں پہ آج بھی انکار ہی تو ہے

۱۹۷۴ء وہ لمحہ جب میں نے فلم انڈسٹری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ (شاعر)

O

جس کو دیکھ کے شاعر تم للچائے بہت
اس میں بھی تھی روشنی کم اور سائے بہت

آئینے کا سحر ہے یا اندازِ نظر
اپنا عکس ہی اپنے روپ دکھائے بہت

کل جو چہرہ نظر نظر کا محور تھا
آج وہ چہرہ دیکھ کے جی بھر آئے بہت

جوڑے میں جو پھول تھا کل، اب گود میں ہے
دیکھ کے اُس کو بیتے دن یاد آئے بہت

تجھ سے تھا پیمانِ وفا سو قائم ہے
پھول سے لوگوں نے پتھر برسائے بہت

چہرے کی خاموش لکیریں کہتی ہیں
شرحِ سخن ہے، کہنے کے پیرائے بہت

ہونٹوں پر اِک زخمِ تبسم آج بھی ہے
جسموں کی تکفین نے راز چھپائے بہت

بہرے جذبے روح کی چیخیں کیا سنتے
ٹھنڈی پڑی ریل تلے چلّائے بہت

حبس سہی کمرے میں رہو تو اچھا ہے
باہر تیز ہوا تو دھول اُڑائے بہت

اپنے وطن میں وہ سچا ہے جو یارو
سچائی کو جھوٹے منہ بہلائے بہت

شاعر اپنے گھر کا خدا ہی حافظ ہے
اِس گھر کو ہیں گھیرے ہوئے ہمسائے بہت

O

آدمی ہوں کہ دیوتا ہوں میں
جو بھی ہوں، تیرا آئینہ ہوں میں
کبھی خلوت ملے تو غور سے سن
تیرے دل کی کوئی صدا ہوں میں
تیری ہر اِک ادا سے تھا جو عیاں
وہی خاموش مدعا ہوں میں
اور یہ بات بھی ہے غور طلب
کل تھا کیا اور آج کیا ہوں میں

اِس قدر دور تھا تو پھر کیسے
اتنا نزدیک آ گیا ہوں میں
کوئی پتھر نہ تھا کہ چپ رہتا
آگ ہی تھا، دہک اُٹھا ہوں میں
تو بھی ہے طعنہ زن تو سوچ میں ہوں
واقعی کس قدر بُرا ہوں میں
تو مری حد میں کیا سمٹ آیا
اپنی حد سے گزر گیا ہوں میں

O

میں اپنی بازیافت کہوں یا خدا کہوں
جی چاہتا ہے جو بھی کہوں، برملا کہوں

O

اُس کے غم کو، غمِ ہستی تو مرے دل نہ بنا
زیست مشکل ہے اِسے اور بھی مشکل نہ بنا

تو بھی محدود نہ ہو مجھ کو بھی محدود نہ کر
اپنے نقشِ کفِ پا کو مری منزل نہ بنا

اور بڑھ جائے گی ویرانیء دل، جانِ جہاں
میری خلوت گہہِ خاموش کو محفل نہ بنا

دل کے ہر کھیل میں ہوتا ہے بہت جاں کا زیاں
عشق کو عشق سمجھ، مشغلۂ دل نہ بنا

پھر مری آس بندھا کر مجھے مایوس نہ کر
حاصلِ غم کو خدارا غمِ حاصل نہ بنا

O

ہر زخمِ دل کا لطف تھا تیغِ جفا کے ساتھ
کیا کیا معاملے تھے کسی کج ادا کے ساتھ

وہ اِک سپردگی سی، بہ اندازِ بے رخی
وہ دوریوں میں قرب سا عہدِ وفا کے ساتھ

وہ ایک التفات کا عالم بہ احتیاط
وہ بے نیازیاں تیری، ناز و ادا کے ساتھ

وہ اِک نگاہ قہر بہ عنوان دوستی
وہ دوست داریاں، ستمِ ناروا کے ساتھ

وہ جلوتوں کا روپ کہ بیگانگی تمام
وہ خلوتوں میں جلوہ نمائی حیا کے ساتھ

وہ پھول پھول زخم، وہ آنسو گہر گہر
کتنے چراغ بجھ گئے موجِ ہوا کے ساتھ

وہ کیفِ درد، کربِ مسرت، نشاطِ غم
کیا کیا نوازشیں تھیں کسی بے نوا کے ساتھ

اے کاش ہم بھی سیکھتے آدابِ بندگی
دو چار دن نباہتے ہم بھی خدا کے ساتھ

کیا جانے کب بر آئے تمنائے باز دید
شاعر وداع کیجیے اُس کو دعا کے ساتھ

O

یہ آرزو ہی رہی، کوئی آرزو کرتے
خود اپنی آگ میں جلتے، جگر لہو کرتے

ترے جمال کا پَرتَو نگاہ میں ہوتا
کبھی صبا سے، کبھی گُل سے گفتگو کرتے

ترے خیال میں گم ہو کے اِک غزل کہتے
اور اِس کلام کو رسوا نہ کو بہ کو کرتے

ہم اہلِ دل کو بہت تھا یہ نشۂ غم بھی
اِسی شراب سے روشن سبو سبو کرتے

یہ احترامِ جنوں ہے کہ سی لیا دامن
وگرنہ ایک تماشا سا کو بہ کو کرتے

ہمیں یقیں ہے اگر تو قریب بھی ہوتا
تو دور جا کے کہیں تیری جستجو کرتے

O

متاعِ درد ملی، سوزِ جاودانہ ملا
بہ فیضِ عشق ہمیں زندگی میں کیا نہ ملا

ہمیں حرم میں نہاں تھے، ہمیں صنم سے عیاں
ہماری ذات سے باہر ہمیں خدا نہ ملا

بھٹکتے پھرتے ہیں دشتِ جنوں میں مثلِ غبار
وہ لوگ جن کو محبت کا آسرا نہ ملا

تمہارے غم میں بھی رکھتے ہیں ہم قرینۂ زیست
تمہارے غم سے شعورِ غمِ زمانہ ملا

اُنہیں کے خوں سے ہے گلزار، خاکِ کنجِ حرم
جنہیں بفضلِ خدا، سایۂ خدا نہ ملا

بنا نہ دیں کسی دیوار ہی کو در یہ اسیر
اگر قفس سے رہائی کا راستہ نہ ملا

O

خداوندا، یہ کیسی آگ سی جلتی ہے سینے میں
تمنا جو نہ پوری ہو، وہ کیوں پلتی ہے سینے میں

نہ جانے یہ شبِ غم، صبح تک کیا رنگ لائے گی
نفس کے ساتھ اِک تلوار سی چلتی ہے سینے میں

میں جتنا توڑتا ہوں، حلقۂ زنجیرِ وحشت کو
اُسی سرعت سے اِک زنجیرِ نو ڈھلتی ہے سینے میں

کوئی انجام اے دورِ کشاکش، اب نہیں یارا
کہ اب تو آرزوئے زیست بھی کھلتی ہے سینے میں

کسے معلوم تھا شاعر کہ ہو گی دشمنِ جاں بھی
وہ حسرت، خونِ دل پی پی کے جو پلتی ہے سینے میں

O

اہتمامِ شبِ ہجراں ہو گا
پھر ان آنکھوں میں چراغاں ہو گا

یاد بن کر رگِ جاں میں کوئی
درد کی طرح خراماں ہو گا

پھر خلاء میں کوئی نادیدہ جمال
مرکزِ دیدۂ حیراں ہو گا

تیز تر ہو گی ہوا کی یورش
اور چراغِ تہہِ داماں ہو گا

یہ حسیں داغ مبارک شاعر
دل حریفِ مہِ تاباں ہو گا

ادھوری غزلیں

خورشید بجھ گیا تو زمیں جگمگا اُٹھی
گردوں پہ خاک ڈالنے یوں گردِ پا اُٹھی

کیا خواب تھا کہ روئے سحر ہے عرق عرق
کیوں اشک اشک بسترِ گل سے صبا اُٹھی

جل بجھ چکے وہ خواب، وہ آنکھیں کھنڈر ہوئیں
اب یہ گھٹا برسنے کو اُٹھی تو کیا، اُٹھی

رہ جائے اِک نگاہ کا پردہ ہی درمیاں
تہذیب کے بدن سے تو رسمِ قبا اُٹھی

O

سائے چمک رہے تھے، سیاست کی بات تھی
آنکھیں کھلیں تو صبح کے پردے میں رات تھی

میں تو سمجھ رہا تھا کہ مجھ پر ہے مہرباں
دیوار کی یہ چھاؤں تو سورج کے ساتھ تھی

تیری جفا تو موردِ الزام تھی، نہ ہے
میری وفا بھی کوششِ تکمیلِ ذات تھی

کس درجہ ہولناک ہے شاعر شعورِ ذات
کتنی حسین پہلے یہی کائنات تھی

O

وہ آدمی ہے تو کیوں مجھ سے دور اتنا ہے
وہ خاک ہے تو اُسے کیوں غرور اتنا ہے

نظر میں کوئی بھی جچتا نہیں ہے اپنے سوا
کہ آگہی کے نشے میں سُرور اتنا ہے

دراز دست نہ کر دے، وفورِ تشنہ لبی
طلب کے باب میں دل، ناصبور اتنا ہے

یقین آئے نہ کیوں، اُس کی پارسائی کا
کہ دل سیاہ سہی، رُخ پہ نور اتنا ہے

O

روتا ہے دل تو روئے، لبوں پر فغاں نہ ہو
یہ حکم ہے کہ آگ جلے اور دھواں نہ ہو

زخموں کو پھول، اشک کو شبنم کہو کہ اب
صاحب یہ چاہتے ہیں کہ غم کا بیاں نہ ہو

دامن کو چاک کیجیے اِس احتیاط سے
اہلِ جہاں کو زخمِ جگر کا گماں نہ ہو

لب بستگی کو دیجیے، آدابِ دل کا نام
آنکھوں میں بات کیجیے، رسوا زباں نہ ہو

O

دشتِ وفا میں دور تک موج سراب دیکھنا
دیدۂ خواب آشنا، حاصلِ خواب دیکھنا

عرصہ گہہ نمود میں، رزمِ زیان و سود میں
شورشِ موج دیکھنا، رقصِ حباب دیکھنا

خواب و خیال سینہ شق، نقش و نگار چہرہ فق
فکر و نظر ورق ورق، دل کی کتاب دیکھنا

O

ترے خیال کا پر تو ہے یا کہ تو ہے کہیں
یہ کائنات حسیں تھی، پر اس قدر تو نہیں

صبا گزرتی ہے چھو کر تو جاگ اُٹھتا ہے
وہ لمس جو مرے احساس میں نہاں ہے کہیں

نمودِ صبح کے منظر میں کھو گئی ہے نگاہ
اُبھر رہا ہے تصور میں تیرا نقشِ جبیں

O

حلقہ بگوش رہ کے کٹی جن کی زندگی
وہ کیا سمجھ سکیں گے مقامِ خود آگہی

وہ گل کسی بہار کا احسان کیوں اٹھائے
جس کو ملی ہے زخمِ جگر کی شگفتگی

یہ بھی ہے ماہتاب پرستی کی اِک ادا
جب اُس کو چھو نہ پائے تو خاک اُس پہ پھینک دی

حمایت علی شاعر کی کتابیں

شاعری

1۔ آگ میں پھول (نظمیں،غزلیں،رباعیات)
2۔ مٹی کا قرض (ثلاثیاں،نظمیں،غزلیں)
3۔ تشنگی کا سفر (طویل افسانوی اور تمثیلی نظمیں اور غنائیے)
4۔ ہارون کی آواز (نظمیں،غزلیں اور ایک طویل نظم)
5۔ آئینہ در آئینہ (منظوم خودنوشت سوانح حیات)
6۔ حرف حرف روشنی (منتخب کلام)
7۔ عقیدت کا سفر (سات سو سال کی نعتیہ شاعری کا انتخاب)
8۔ تجھ کو معلوم نہیں (منتخب فلمی نغمات)
9۔ چاند کی دھوپ (تازہ کلام)

تراجم

بنگال سے کوریا تک (طویل افسانوی نظم)

1. *Flower in Flames* By Prof: Rajinder Singh Verma
(Panjabi University Patyala. India)
2. *Flute and Bugle* By Parkash Chander
(Editor. "Times of India" Delhi)

3۔(ہندی) ترجمہ نگار: پروفیسر جی این نداف (مولانا آزاد کالج،اورنگ آباد)

4۔(سندھی) گل باہ مہ۔ترجمہ نگار: ایم ای عالمانی (حیدر آباد،سندھ)

حرف حرف روشنی (طویل نظم اور منتخب کلام)

1.*Every Word Aglow* By Prof: Rajinder Singh Verma

Mr. C.Gaius Bhatul

2۔حرف حرف روشنی (ہندی) ترجمہ نگار: بھگ تل (مہاراشٹر)

3۔ شبد شبد پرکاش (ہندی) ترجمہ نگار: قاضی رئیس (مہاراشٹر)

نثری کتب

1۔ شیخ ایاز (سندھی کے جدید عہد آفریں شاعر کا مطالعہ)

2۔ شخص و عکس (مقالات، تبصرے اور مباحث)

3۔ کھلتے کنول سے لوگ (حیدرآباد دکن کے اہلِ قلم)

4۔ حمایت علی شاعر کے ڈرامے (ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے)

تراجم

1۔ حمایت علی شاعر جاڑ راما (رشید احمد لاشاری، ایم بی انصاری، ممتاز مرزا، محمد اسحاق پیر سرہندی)

اختلافی مباحث

1۔ کسی چمن میں رہو تم (مرتب، قاصد عزیز اور نعمت اللہ)

2۔ احوالِ واقعی (مرتب، پروفیسر مرزا سلیم بیگ)

3۔ بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک (مرتب، رعنا اقبال)

4۔ تثلیث یا ثلاثی (مرتب، رعنا اقبال)

حمایت علی شاعر... فن و شخصیت (مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

مقالہ نگار: رعنا اقبال (ڈپٹی ڈائریکٹر ریسرچ وانفارمیشن، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی)

منتظرِ اشاعت

1۔ نقطۂ نظر (تحقیقی اور تجزیاتی مضامین)

2۔ مہران موج (سندھ کی عوامی کہانیوں کا تمثیلی روپ)

3۔ چنگاریاں (اردو شاعرات کا مطالعہ)

4۔ نئی پود (نئی نسل کے اہلِ قلم)